انگوٹھا
ایم مبین

ایم مبین

ISBN: 81-86-735-35-6

نام کتاب	:	انگوٹھا
مصنف	:	ایم مبین
سالِ اشاعت	:	۲۰۱۲ء
قیمت	:	۲۰۰/-
کمپوزنگ	:	بلال ناصر
طباعت	:	اوشن پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

ANGUTHA By M.Mubeen

(Novel) 2012 Rs. 200/-

OSHAN PUBLICATIONS
922, Kucha Rohilla, Daryaganj, New Delhi-110002
Email: oshan.publications1@gmail.com
Mob. 09990422798, Ph.: 011-32662433

انتساب

قارئین کے نام

جو آج کے اس الکٹرانیک میڈیا

کے زمانے میں بھی

کتابیں پڑھ کر

اس عظیم وراثت کی

حفاظت کر رہے ہیں

انگوٹھا

از: ایم مبین

دلیپ کے جاگنے سے قبل ہی پوشیا جاگ گیا تھا۔ جب دلیپ کی آنکھ کھلی تو وہ رات کا آخری پہر تھا۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں تھیں۔ چاروں طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے باہر آیا اور جب آنگن میں قدم رکھ کر طبیلے کی طرف نظر ڈالی تو وہاں بلب جل رہا تھا۔

یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ پوشیا جاگ گیا ہے۔ پوشیا دلیپ سے قبل ہی جاگتا تھا اور اکثر وہی دلیپ کو بیدار کرتا تھا۔ کبھی کبھی دلیپ کے معمول میں فرق آجاتا تھا لیکن پوشیا کے معمول میں فرق نہیں آتا تھا۔ جب اس نے طبیلے میں قدم رکھا تو پوشیا طبیلہ صاف کر چکا تھا۔ کہیں بھی گوبر یا فاضل گھاس پھوس کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس جگہ کی صفائی سے ایسا لگ رہا تھا کہ پوشیا کم سے کم دیڑھ دو گھنٹہ قبل ہی جاگ گیا ہے اور صاف صفائی میں لگ گیا ہے۔ پوشیا طبیلے میں نہیں تھا یہ اس کا مطلب وہ کچرہ پھینکنے گیا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی دودھ دھونے والی بالٹی کو ایک بھیس کے پاس رکھا تو اسے پوشیا کچرا پھینک کر آتا دکھائی دیا۔

''بابا آج جلدی جاگ گئے تھے کیا''...اس نے یونہی بے مقصد پوشیا سے سوال کیا۔

''نہیں.... میں تو اپنے وقت پر جاگا تھا لیکن تو یہ کیوں پوچھ رہا ہے؟'' پوشیا نے جواب دیا۔ ''سارے طبیلے کی صفائی ہو چکی ہے اس لیے پوچھ رہا ہوں۔'' دلیپ نے جواب دیا۔

''اچھا ہوا، تو جاگ گیا'' پوشیا بولا ''ورنہ میں تجھے جگانے ہی والا تھا۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

وہ بھینس کا دودھ دھونے لگا۔

ایک سے دوسری اور اس کے بعد تیسری بھینس کے دھونے کا سلسلہ چلتا رہا۔

جب اس کی بالٹی بھر جاتی تو وہ اس دودھ کو جا کر بیس لیٹر کے بڑے سے جرمن کے کین میں الٹ دیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چاروں بھینسوں کا دودھ دھولیا اور اس کے دونوں بیس بیس لیٹر کے کین بھر گئے۔ ان بھرے ہوئے کینوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی رقصاں کرنے لگی۔ اس نے ممنون نگاہوں سے اپنی چاروں بھینسوں کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر ان کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

جگالی کرتی بھینسوں کو اپنے جسم پر کسی کا شفیق ہاتھ محسوس ہوا تو انھوں نے پلٹ کر دیکھا جب دلیپ پر نظر پڑی تو وہ پھر سے اپنے معمول کے فعل میں مشغول ہو گئیں۔ آج بھینسوں نے اچھا دودھ دیا تھا ورنہ کئی دنوں سے پانچ چھ لیٹر دودھ کم دے رہی تھیں۔

''کتنا دودھ نکلا'' وہ کام ختم کر چکا تو پوشیا نے اسے آواز دے کر پوچھا۔

''بابا آج پورا بیس لیٹر نکلا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''بھگوان کا شکر ہے'' پوشیا کے منہ سے نکلا۔

اس نے دونوں کین اپنی سائیکل پر لٹکائے اور پھر تیار ہونے لگا۔

مالتی بھی جاگ گئی تھی۔ اس نے اس کے لیے چائے بنائی۔ غسل کے نام پر اس نے اپنے

جسم کوتر کیا، چائے پی، چائے کے ساتھ رات کی باسی ایک روٹی کھائی اور اپنے گھر سے باہر آیا۔

پوشیا آنگن میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

''بابا میں جا رہا ہوں، آج کچھ لانا ہے۔'' اس نے پوشیا سے پوچھا۔

''جا بیٹے جا... مجھے کیا چاہیے۔ گھر میں بہو سے پوچھ لے کچھ لانا ہے کیا؟'' پوشیا نے جواب دیا۔ مالتی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ رات ہی اسے بتا چکی تھی کہ کیا کیا لانا ہے۔

ویسے اسے زیادہ سامان لانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ گھر کا سارا سامان موہن لے آتا تھا کیونکہ وہ ایک کرانہ کی دکان پر کام کرتا تھا۔ اس لیے یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ گھر کے لیے ضروری سامان وہی لائے۔۔

وہ سائیکل کو کھینچتا سڑک تک آیا۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ دونوں جانب سے بڑے بڑے ٹرک آ جا رہے تھے۔ دو سالوں میں اس سڑک کی آمد و رفت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ رات بھر اس سڑک پر سواریاں آتی جاتی تھیں۔ سڑک بھی پختہ ہو گئی تھی۔ سڑک پر آ کر وہ سائیکل پر بیٹھا اور شہر کی طرف چل دیا۔

اس کی سائیکل کی دونوں جانب بیس بیس لیٹر دودھ کے کین لٹک رہے تھے اس لیے اسے سائیکل چلاتے ہوئے اپنا توازن برقرار رکھنا پڑتا تھا۔ اگر اس کا ذرا بھی توازن بگڑتا تو کین کے وزن سے سائیکل کے گر جانے کا خدشہ تھا اور سائیکل کے گرنے کا مطلب تھا سارے دودھ کا گر کر ضائع ہو جانا جو اس کی اس دن کی کمائی ہوتی تھی۔

سردیوں کے دن تھے.... سردی بڑھتی جا رہی تھی سائیکل کے ہینڈل پر اس کے ہاتھ جم رہے تھے اور پیڈل مارتے ہوئے پنجے شل ہو رہے تھے۔ یہ روزانہ اس کے ساتھ ہوتا تھا لیکن کیونکہ یہ اس کے معمولات میں سے تھا اس لیے وہ آسانی سے اپنا سفر طے کر کے منزل پر پہنچ جاتا تھا۔ کبھی کبھی پیچھے سے آنے والے تیز رفتار ٹرکوں سے ڈر لگتا تھا۔ ٹرک پوری رفتار سے اس کے بازو

سے گذرتے تھے تو ایک ہوا کا جھونکا اٹھتا تھا۔ کبھی کبھی اس جھونکے میں اتنی قوت ہوتی تھی کہ اس کی سائیکل لڑکھڑا جاتی تھی اور اسے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

جب وہ شہر میں داخل ہوا تو پورا شہر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف سڑکوں کی بتیاں جلی ہوئی تھی۔ سڑکیں ویران تھیں لیکن ماموں کی دکان کھل گئی تھی۔ ابراہیم ماموں دودھ والا شہر کا مانا ہوا دودھ کا بیوپاری تھا۔ اس کے جیسے پچاسوں دودھ والے اس کے پاس دودھ دیتے تھے۔ اس کی شہر میں کئی دکانیں تھیں۔ پورے شہر کے لیے وہی دودھ کا نرخ طے کرتا تھا۔

کم دودھ آنے کی صورت میں دودھ کے دام دو روپیہ سے چار روپیہ تک بڑھ جاتے تھے۔ زیادہ آنے کی صورت میں دودھ کے نرخ معمول کے داموں سے دو تین روپیہ کم ہو جاتا تھا۔ ان کے لیے دودھ کا کوئی دام مقرر نہیں تھا۔

وہ دودھ والوں سے فی لیٹر دو روپیہ کمیشن لیتا تھا۔ اس کے بیس لیٹر پر اسے چالیس روپیہ کمیشن دینا پڑتا تھا۔ لیکن اسے اور اس کے جیسے سینکڑوں دودھ والوں کو گھروں گھر جا کر یا ہوٹلوں میں دودھ فروخت کرنے سے نجات مل جاتی تھی۔

گھروں گھر جا کر دودھ فروخت کرنے میں یہ مشکل تھی کے گھر والے پیسہ مہینے یا پندرہ دن میں دیتے تھے۔ اس طرح کبھی کبھی پیسوں کی سخت ضرورت پڑنے پر بھی انھیں پیسے نہیں مل پاتے تھے۔

لیکن ابراہیم ماموں کے یہاں پر انھیں نقد پیسہ مل جاتا تھا۔ دودھ فروخت ہو یا نہ ہو یہ ان کی ذمہ داری نہیں تھی۔ نو بجے انھیں دو روپیہ کمیشن کاٹ کر اپنے دودھ کے دام مل جاتے تھے۔ کبھی کبھی کچھ زائد کی ضرورت بھی ہو تو ابراہیم انھیں پیسہ دے دیتا تھا اور اس بات کی سہولت بھی تھی کہ وہ پیسہ دوسرے دن ادا کر دے یا چار پانچ دنوں میں قسطوں میں دودھ کی قیمت میں کاٹ کر بھی ادا کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ دودھ ابراہیم کو ہی فروخت کرتا تھا۔

دوتین ہوٹل والوں نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ دودھ انھیں دے دیا کرے۔ جو دام ابراہیم بھائی دیتا ہے وہ بھی وہی دام دیں گے۔ کمیشن وغیرہ نہیں کاٹیں گے۔ لیکن وہ اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

پو پھٹ گئی تھی اور دھیرے دھیرے اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ویران سڑکوں پر اکا دکا لوگ دکھائی دینے لگے تھے۔ ابھی دوتین گھنٹہ اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ اسے ۹ ربجے دوبارہ ابراہیم بھائی کے پاس آنا تھا۔ اپنے دودھ کا حساب لینے کے لیے۔ اس دوران اس کا اس کے جیسے دوسرے دودھ فروخت کرنے والوں کا ایک اڈہ تھا جہاں ہو بیٹھ کر دنیا جہاں کی باتیں کرتے تھے اور اپنا وقت بھی گذارتے تھے۔

شیکھرانا کی ہوٹل.........

شیکھرانا کی ہوٹل ایک سڑک کے کنارے بنی کچی بڑی سے ہوٹل تھی جو سویرے سب سے پہلے کھل جاتی تھی۔ اس ہوٹل میں بیٹھنے کے لیے کافی جگہ تھی ۔سویرے شیکھر جلد ہی چائے کے ساتھ بھجیے، وڑا وغیرہ بھی بنا دیتا تھا۔ آٹھ سے دس کلومیٹر سائیکل پر بوجھ لاد کر لانے میں کافی محنت اور طاقت لگتی تھی۔ شہر پہنچنے کے بعد ہر کسی کو بھوک لگتی تھی۔

ایسے میں انا کی ہوٹل ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں پہ انھیں ناشتہ کم داموں میں ملتا تھا۔

اس وقت دوسری ہوٹلیں بھی کھل کاتی تھیں۔

لیکن وہاں تازہ ناشتہ نہیں ملتا تھا۔ جو بھی ہوتا تھا رات کا باسی ہوتا تھا۔ داموں میں بھی فرق ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں ہوتی تھی۔

اس کے زیادہ تر دودھ والے شیکھر کی ہوٹل میں ناشتہ کرنا اور وقت گذارنا پسند کرتے تھے ۔اگر وہ شیکھر لہ ہوٹل میں بیکار شام تک بھی بیٹھے رہے تو شیکھر انھیں نہیں ٹوکتا تھا کیونکہ وہ سب شیکھر کے روزانہ کے گاہک تھے اور ہر کسی سے شیکھر اچھی طرح واقف تھا۔

اس نے سائیکل ہوٹل کے پاس کھڑی کی اور ہوٹل میں آیا تو تقریباً سبھی روزانہ کے ساتھی آ چکے تھے۔ گرم گرم مسل کی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ شیکھر کا نوکر بھجیے تل چکا تھا اور اس وقت وڑا تل رہا تھا۔ وڑے کے تلے جانے سے جو سحر انگیز خوشبو اٹھتی تھی وہ اس کے نتھنوں سے ٹکراتی تو اس کی بھوک چمک اٹھی۔

''نمسکار شنکر!'' کہتے ہوئے وہ ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا جس پر شنکر ناشتہ کر رہا تھا۔

''نمسکار دلیپ! آؤ ناشتہ کرو''... شنکر نے جواب دیا۔

''نہیں نہیں تم جاری رکھو..... میں اپنا ناشتہ منگواتا ہوں''... کہتے ہوئے اس نے ہوٹل کے ایک نوکر کو ایک مسل پاؤ اور ایک وڑا پاؤ کا آرڈر دیا۔

'اور بتاؤ کیسا چل رہا ہے...؟''

''ٹھیک چل رہا ہے''.... شنکر نے کہا ''اب یہ روز روز دودھ فروخت کرنے کے لیے شہر آنے والے کام سے نجات ملنے والی ہے۔''

''کیوں بھائی؟'' اس نے ہنس کر پوچھا۔ ''کیا کوئی دوسرا کام ڈھونڈ لیا کیا؟''

''ارے نہیں، اب تو کام کرنے سے بھی نجات ملنے والی ہے۔''

شنکر نے ہنس کر کہا.... ''کیا مرنے کا ارادہ ہے؟''

اس نے بھی ہنس کر پوچھا.... ''مرنا کہاں؟ اب تو جینا اور زندگی شروع ہونے والی ہے۔''

شنکر بولا... ''پہلیاں مت بجھاؤ؟ بتاؤ کیا بات ہے.....؟''

''میری زمین کا سودا ہو گیا ہے۔ سودا ایک کروڑ روپیہ میں ہوا ہے۔'' شنکر مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ایک کروڑ روپیہ میں؟'' حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاں دلیپ بھائی!'' شنکر نے جواب دیا۔

''تو تم جلد ہی کروڑ پتی بننے والے ہو؟'' دلیپ نے پوچھا۔

''ہاں دلیپ بھائی..........''

''تمہاری اتنی سی زمین کے ایک کروڑ روپے آ رہے ہیں۔''

''ہاں........''

''واہ یار! کیا بازی ماری........'' دلیپ نے کہا۔

''یہ بازی ہم سے پہلے اشوک مار چکا ہے۔ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ ایسا موقع میرے ہاتھ کیوں نہیں آتا ہے، وہ آ گیا۔ کوئی کمپنی ہے...وہاں پر وہ اپنی کمپنی کا پلانٹ ڈالنا چاہتی ہے۔ این اے وغیرہ وہ سب کرائے گی۔ اس نے دس لوگوں کی زمینیں خریدی ہیں۔ ان میں میری بھی زمین شامل ہے۔'' شنکر نے بتایا۔

''ایک کروڑ روپیوں کا تم کیا کرو گے؟''........ ناشتہ آ گیا تھا... پاؤ توڑ کر مسل میں ڈبوتے ہوئے دلیپ نے شنکر سے پوچھا۔

''سب سے پہلے گاؤں کا مکان توڑ کے اس پر ایک شاندار بنگلہ بناؤں گا۔ ایک کار اور ایک جیپ خریدوں گا۔ کار اپنے خود کے استعمال کے لیے اور جیپ کرائے سے چلانے کے لیے دے دوں گا۔ اس سے آمدنی ہوتی رہے گی۔''

''اس کے بعد کام کیا کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''کام کرنے کی کیا ضرورت؟ زندگی بھر تو کام کرتے رہے۔ اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ گاؤں میں گرام پنچایت کے الیکشن ہونے والے ہیں۔ تم تو جانتے ہو میں ایک سیاسی پارٹی کا بیس سالوں سے ورکر ہوں۔ سوچتا ہوں اس کی طرف سے اس بار الیکشن لڑوں۔ تھوڑا پیسہ خرچ کروں گا تو جیت جاؤں گا۔ ایک بار گرام پنچایت میں بھی جیت گیا تو کافی ہے۔ اس کے بعد کا سلسلہ خود بخود شروع رہے گا۔''

شنکر بتا رہا تھا اور اس کے ذہن میں اشوک، کیشو اور ڈھونڈ وگھوم رہے تھے۔ اب شنکر ان کی صف میں شامل ہونے جا رہا ہے۔ وہ تصور میں دیکھ رہا تھا کہ شنکر اس کے سامنے ایک قیمتی صوفے پر بیٹھا ہے۔

اس کے بے ترتیب بال سلیقے سے بنے ہیں۔ بڑھی ہوئی داڑھی کی جگہ کلین شیو ہے۔ جسم پر سفید بے داغ قیمتی کپڑے ہیں جن سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں۔ گلے میں دو تین موٹی موٹی سونے کی چین ہے اور ہاتھوں کی انگلیوں میں کئی موٹی موٹی انگوٹھیاں۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''.....اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر شنکر نے اسے ٹوکا۔

''تمھارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا؟ اب تو تم ہم سے ملنے یہاں نہیں آؤ گے۔''

''کبھی کبھی آجایا کروں گا'' شنکر نے ہنس کر جواب دیا.....''جس طرح اشوک اور کیشو وغیرہ آتے ہیں۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ ناشتہ کرنے میں مشغول ہو گیا لیکن اس کے کان ہوٹل میں بیٹھے بات چیت کرنے والے لوگوں کی آوازوں پہ لگے تھے۔

''کشور تمھاری زمین کا کیا ہوا؟''

''دس لاکھ میں معاملہ اٹکا ہے، میں جو قیمت مانگ رہا ہوں اس سے دس لاکھ کم دے رہے ہیں۔''

''تو دے کیوں نہیں دیتے؟ دس لاکھ کم صحیح.........''

''نہیں! کچھ دن اور رک گیا تو دس لاکھ اور زیادہ آئیں گے.........''

''مادھو کی زمین تو گئی۔''

''اس کی اچھی قیمت آئی ہے۔''

''اسے منہ مانگی قیمت ملی ہے۔ وہ بڑا لکی ہے۔ ابھی صرف آدھی زمین فروخت کی ہے۔

اس میں وہ کروڑ پتی بن گیا۔ آدھی زمین باقی ہے............''

''میری زمین کے لیے بھی ایک دلال آیا تھا............؟''

''بھئی تمہاری باتیں سن سن کر مجھے بھی لگ رہا ہے کہ مجھے بھی اپنی زمین فروخت کر کے اس روز روز کے جھمیلے سے نجات حاصل کر لینی چاہیے۔ ارے دیر کس کے لیے کر رہے ہو۔ تمہارے علاقے میں تو زمین کی بہت زیادہ قیمتیں ہیں۔''

ان باتوں کو سن کر دلیپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ کچھ دنوں میں گفتگو کا موضوع کتنا بدل گیا ہے۔ آج ہر کوئی صرف اور صرف زمین ، زمین کی خرید وفروخت ، ان کی قیمتوں کے بارے میں باتیں کرتا ہے۔ ورنہ کچھ سالوں قبل تک کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں ہوتی تھی۔

گفتگو کے موضوع طے شدہ تھے۔

میری بھینس نے آج کم دودھ دیا۔

میرا ایک بھینس بیمار ہے۔

میری ایک بھینس مر گئی ہے۔

اس انجکشن کے دینے سے میری بھینس زیادہ دودھ دینے لگی ہے۔

تین دنوں سے سیٹھ نے دودھ کے پیسے نہیں دیے ہیں۔

چونی بھوسی والے نے چونی بھوسی اور کھانڈ کے دام پھر بڑھا دیے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح دھندہ کریں۔ دودھ کے دام تو نہیں بڑھ رہے ہیں لیکن کھاد کے دام بڑھ رہے ہیں۔

گجرات سے میں نے دو بھینس منگوائی ہیں۔

گجرات میں بھی بھینسوں کے دام بڑھ گئے ہیں۔

کیا کریں ہماری بھینس اتنا دودھ نہیں دیتی ہیں جتنا گجرات کی بھینسیں دیتی ہیں۔

شاکر سیٹھ نے ہمارے گاؤں میں بھینس کا طبیلہ شروع کیا ہے............

ارے اب تو مارواڑی لوگ بھی ہماری دھندے میں آنے لگے ہیں۔ لکشمی چند مارواڑی نے ہمارے گاؤں میں بھینسوں کا طبیلہ شروع کرنے کے لیے جگہ خریدی ہے۔

لیکن اب یہ باتیں مشکل سے سنائی دیتی تھیں۔

صرف اور صرف زمین کی خرید وفروخت کی باتیں اور زمینوں کے فروخت سے حاصل ہونے والے پیسے اور بعد کی زندگی کی باتیں.......

جو لوگ ان کے ساتھ رہتے تھے زمینیں فروخت کرنے کے بعد جب وہ ان سے ملنے کے لیے آتے تھے اور اپنی نئی زندگی کے بارے میں بتاتے تھے تو ان کی عیش وآرام سے بھری زندگی دیکھ کر ہر کسی کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ وہ اپنی زمین فروخت کر کے اس روز روز کی جھنجھٹ سے نجات پالے اور عیش وآرام بھری زندگی بسر کرے۔

کبھی کبھی دلیپ کے دل میں بھی یہ خیال آتا تھا..........

لیکن اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ پوشیا اندریا پاٹل کا سخت چہرہ گھومنے لگتا تھا۔

اپنے دونوں بھائی سندر اور موہن کے چہرے گھومنے لگتے تھے۔

اپنی ماں رکمنی کا چہرہ گھومنے لگتا تھا۔

بہن شیلا اور مایا کے چہرے ناچنے لگتے تھے۔

پھر وہ تمام چہرے ایک دوسرے میں مدغن ہو کر اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے تھے۔

اور وہ گھبرا جاتا.........

اپنا سر جھٹک دیتا.........

اور اس خیال کو ہی ذہن سے نکال دیتا۔

نو بجے تک وہ شیکھر کی ہوٹل میں بیٹھا دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

نو بجے شیکھر کو ناشتے کا بل دے کر اپنی سائیکل لے کر ماموں کی دودھ کی دکان کی طرف چل پڑا۔

دکان پر ماموں کا لڑکا پرویز دودھ والوں کا حساب دے رہا تھا۔

اس پر نظر پڑتے ہی اس نے پوچھا ''دلیپ آج تیرا کتنا دودھ ہے؟''

''بیس لیٹر سیٹھ''

''ٹھیک ہے!'' کہتے ہوئے اس نے حساب لگایا اور پیسہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے پیسے گنے ....اس نے جتنا حساب ذہن لگایا تھا پیسہ اتنا ہی تھا۔

''سلام سیٹھ'' اس نے پرویز کو سلام کیا۔

دکان سے اپنے خالی کین اٹھائے۔ انھیں سائیکل پر لٹکایا اور سائیکل پر بیٹھ کر خوراک والے کی دکان کی طرف چل دیا۔

خوراک والے کی دکان سے اس نے بھینسوں کے لیے ضروری خوراک جیسے کھاد، چونی بھوسی، کھانڈ وغیرہ خریدی۔

انھیں اپنی سائیکل پر لادا.........

اور سائیکل پر سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اسے سائیکل پر دس کلومیٹر کا سفر کرنا تھا۔

لیکن یہ اس کے لیے کوئی پریشانی نہیں تھی یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

سورج دھیرے دھیرے آسمان پر بلند ہو رہا تھا اور اس کی تمازت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

سورج کی تیز کرنیں جسم کے کھلے حصوں پر پڑتی تو جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگتیں اور ماتھے پہ پسینہ کی

بندیں ابھرنے لگتیں۔

سائیکل چلانے میں بھی طاقت صرف ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی ہلکی ہلکی سانس پھولنے لگی تھی لیکن اس نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔

یہ روز کا معمول تھا......

دراصل پیٹ بھی خالی ہو گیا تھا۔

ناشتہ کیے اسے کئی گھنٹے ہو گئے تھے اس لیے بھوک کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

منزل جیسے جیسے قریب آ رہی تھی اس کا جوش بڑھ رہا تھا کیونکہ اس نے اندر ایک احساس تھا جو اس کے تمام حواس کو سمجھا رہا تھا کہ منزل پر پہنچتے ہی انھیں تمام تکلیفوں سے راحت مل جائے گی۔

آخر وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

اپنے گھر کے آنگن میں پہنچ کر وہ سائیکل سے اترا۔ آنگن میں داخل ہونے سے قبل ہی اس نے سائیکل کی گھنٹی بجائی تھی جسے سن کر اس کی بیوی مکان کے باہر آ گئی تھی۔ اس نے سائیکل سے لٹکے دونوں کین اتارے تو مالتی نے انھیں اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور انھیں دھونے کے لیے کنویں کی طرف لے جانے لگی۔

اس نے جانوروں کی خوراک کا تھیلہ اٹھایا اور اسے لے کر طبیلہ کی طرف بڑھا۔

اس کا آج کا کام ختم ہو گیا تھا۔

☆☆

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ سو جاتا تھا۔

یہ اس کا معمول تھا۔

اسے بہت سویرے جاگنا پڑتا تھا۔ سویرے چار بجے جاگنا اس کا معمول تھا۔ کیونکہ چار بجے جاگ بنا وہ سارے کاموں کو انجام ہی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ چار بجے جاگنے کے بعد اسے بھینسوں کا دودھ دھونا پڑتا تھا۔ پھر اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر تیار ہو کر دودھ کے کین سائیکل پر لاد کر ۱۰ کلو میٹر دور شہر لے جانا پڑتا تھا۔ دودھ ابراہیم ابھی کی دکان پر ساڑھے پانچ یا چھ بجے تک پہنچنا ضروری تھا۔

اگر کسی وجہ سے دیر ہو جاتی تو سات بجے ابراہیم بھائی کی دکان پر پہنچا تو اس بات کی کوئی گیارنٹی نہیں تھی کہ ابراہیم بھائی اس کا دودھ خریدے گا کیونکہ اگر دودھ کا کوٹا پورا ہو جاتا اور اس دن دودھ کی فروخت کم ہوتی تو تاخیر سے آنے والے دودھ والوں کو ابراہیم بھائی واپس کر دیتا تھا۔

ان کے درمیان یہ ایک طرح کا معاہدہ تھا۔

ایسی صورت میں اسے اور اس جیسے دودھ والوں کو جن کا دودھ اس دن ابراہیم بھائی نہیں

خریدا ہو شہر کے چوراہوں پر بیٹھ کر یا گھر گھر جا کر دودھ فروخت کرنا پڑتا تھا۔ اس میں کئی مسائل تھے۔

کبھی کبھی ایک دو گھنٹے میں دودھ فروخت ہو جاتا تھا۔ انھیں میٹشن بھی نہیں دینا پڑتا تھا اور پیسے بھی نقد مل جاتے تھے اور کبھی کبھی ۱۲ ربجے تک بھی دودھ نہیں فروخت ہو پاتا تھا۔ ۱۰ ربجے کے بعد انھیں دودھ فروخت کرنے کے لیے دودھ کے دام کم کرنے پڑتے تھے۔ پھر بچا ہوا دودھ واپس گھر لے جانا پڑتا تھا۔

لیکن گھر واپس دودھ لے جا کر بھی کچھ حاصل نہیں تھا۔ گھر میں شام کا یا دوسرے دن کا دودھ تو تیار ہی ہوتا تھا۔ اسی لیے وہ یہی بہتر سمجھتے تھے کہ کم داموں میں گھاٹے سے ہی سہی دودھ فروخت کر دیا جائے۔

ایک دوبار اسے یہ سزا بھگتنی پڑی تھی۔ اس کے بعد اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کبھی اس سزا کو نہیں بھگتے گا۔

اس لیے چار بجے ہی جاگ جاتا تھا یا پھر اسے پوشیا جگا دیتا تھا یا اگر مالتی کی آنکھ کھل جاتی اور وہ اسے سویا پاتی تو اسے جگا دیتی تھی۔ اتنی جلدی جاگنے والے کے لیے دوپہر کی نیند ضروری ہوتی ہے اور اس وقت اس کے ذمے کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے بے فکر ہو کر گھوڑے بیچ کر سو جاتا تھا۔

ہاں ہاں کبھی کبھی کھیت میں زیادہ کام ہوتے تھے تو اسے اپنی نیند کی قربانی دینی پڑتی تھی۔ وہ کھیت میں ماں، باپ، بیوی اور دونوں بھائیوں کے ساتھ کام میں لگ جاتا تھا۔ عام طور پر کام بارش کے دنوں میں ہی ہوتا تھا۔ جب کھیت میں چاول بویا جاتا تھا۔

چاول کی فصل ایک بہت ہی محنت مشقت طلب فصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے پورے خاندان کو کھیتوں میں کام کرنا پڑتا ہے یا پھر مزدور سے کام کروانا پڑتا ہے اور عام طور پر ان دنوں

کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور نہیں ملتے جو ملتے ہیں ان کے دام آسمان پر ہوتے ہیں۔

اس لیے برسوں سے ان کے خاندان کا یہ معمول تھا کہ وہ خود کھیت میں کام کرتے تھے۔ کبھی کبھی زیادہ کام ہوتا تو موہن اور سندر بھی اپنے کاموں سے چھٹی لے لیتے تھے۔

دراصل چاول کی فصل ان کے سال بھر کے خرچ کا ایک سہارا ہوتی تھی۔ چاول کا ایک حصہ سال بھر کے استعمال کے لیے رکھ لیا جاتا تھا اور باقی حصہ فروخت کر دیا جاتا تھا۔ اس سے جو پیسے آتے تھے ان سے گھر کے بڑے بڑے خرچ چلائے جاتے تھے۔

وہ پیسے سال بھر تو نہیں چل پاتے تھے۔ کبھی کبھی دو تین مہینوں میں ہی ختم ہو جاتے تھے۔

اس کے بعد سارا خرچ اسے، موہن اور سندر کو چلانا پڑتا تھا۔ اس دن وہ سو کر اٹھا اور اٹھ کر گھر کے آنگن میں آیا تو اسے اپنے پڑوسی رامو کے کھیت میں کچھ لوگ دکھائی دیئے۔ اس کے دل میں تجسس جاگا اور وہ رامو کے کھیت کی طرف بڑھا۔ گھر میں کوئی کام تو نہیں تھا۔ صرف بھینسوں کو شام کا چارا ڈالنا تھا وہ مالتی یا پوشیا ڈال سکتے تھے۔

رامو اس کا پڑوسی تھا۔ اس کے کھیت میں لوگ دیکھ کر اس کے دل نے کہا کچھ گڑ بڑ ہے۔ اسی لیے وہ اس طرف چل دیا۔ قریب پہنچا تو ان اجنبی لوگوں میں سے ایک دو کو وہ پہچان گیا۔ ان میں سے ایک شہر کا مانا ہوا بلڈر تھا۔

وہ اچھی طرح سے رامو کا کھیت دیکھ رہا تھا اور اس کے ساتھی کھیت ناپ رہے تھے۔

''رامو؟'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے رامو سے پوچھا.... ''کیا معاملہ ہے......؟''

''آؤ دلیپ بھائی آؤ.........!''

''رامو کیا معاملہ ہے؟''.....اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''دلیپ میں نے اپنا کھیت فروخت کر دیا ہے۔ یہ من سکھ بھائی ہیں۔ شہر کے مانے ہوئے بلڈر ہیں۔ انھوں نے یہ کھیت خریدا ہے وہ اس جگہ گودام بنانے والے ہیں.....!!''

رامو نے اپنا کھیت فروخت کر دیا یہ سن کر اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

''کتنے میں سودا طے ہوا ہے؟''

''ایک کروڑ میں .... پانچ ایکڑ ہی زمین ہے نا....... من سکھ بھائی کا ارادہ اور پانچ ایکڑ زمین خریدنے کا ہے۔ تمہاری زمین میرے کھیت سے لگ کر ہے۔ انھیں اور پانچ ایکڑ کی ضرورت ہے۔ اگر دلچسپی ہے تو کہو فوراً سودا ہو جائے گا.........'' رامو اسے بتانے لگا۔

رامو کی بات سن کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''دلیپ بھائی کوئی جواب نہیں دیا؟'' اس کے جواب دینے سے پہلے ہی رامو نے پھر اپنا سوال دہرا دیا اور من سکھ بھائی سے مخاطب ہو کر بولا.......

''من سکھ بھائی یہ دلیپ بھائی ہیں۔ میرے پڑوس کا کھیت ان ہی کا ہے۔ آپ اس بارے میں پوچھ رہے تھے نا؟''

''اچھا اچھا! نمسکار دلیپ بھائی'' .... من سکھ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''مجھے دراصل دس ایکڑ زمین کی ضرورت ہے اور رامو کی صرف پانچ ایکڑ زمین ہے کیونکہ تمہاری زمین رامو کی زمین سے مل کر ہے اس لیے اگر اپنی پانچ ایکڑ زمین فروخت کرنے میں دلچسپی ہے تو بولو.....رامو کو پانچ ایکڑ کے لیے ایک کروڑ روپیہ دیئے ہیں.... تم کو بھی ایک کروڑ دوں گا... دلچسپی ہو تو کل میرے آفس آ جانا'' یہ کہتے ہوئے من سکھ نے اس کی طرف اپنا کارڈ بڑھا دیا۔

دلیپ نے کارڈ لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''تم نے جواب نہیں دیا.... زمین بیچنے میں دلچسپی ہے یا نہیں؟'' من سکھ نے اس سے سوال کیا۔

''فی الحال تو نہیں ہے'' اس نے جواب دیا.... ''زمین میرے والد کے نام پر ہے اور میرے دو بھائی اور ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ گھر میں مشورہ کرلو.....آٹھ دس دن کے بعد بھی مجھ سے آکر ملو تو چلے گا مگر زمین فروخت کرنے کا ارادہ ہو تو میرا خیال رکھنا۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں رامو کی زمین ایک کروڑ میں خرید چکا ہوں اور تمہاری زمین رامو کی زمین سے لگ کر ہے۔ میرا کام ہو جائے گا....'' من سکھ پھر بولا۔

پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور وہ من سکھ کا کارڈ لیکر گھر کی طرف چل دیا۔

اس کے ذہن میں من سکھ کی پیش کش چکرا رہی تھی ۔ پانچ ایکڑ زمین کے ایک کروڑ روپے۔

ایک کروڑ....اس نے صرف ایک کروڑ کا نام ہی سنا تھا اور نہ اس کو چھوا تھا۔ رامو نے اپنا کھیت ایک کروڑ میں فروخت کر دیا۔ بھلے اس کا کھیت فروخت ہو گیا مگر وہ راتوں رات کروڑ پتی تو بن گیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ جلد سو جاتا تھا۔

اس دن موہن اور سندر جلد گھر آگئے تھے اور انھوں نے اس سے کھانا کھانے کے دوران کہا تھا۔''دادا ! آج ذرا سونا نہیں کچھ اہم باتیں کرنی ہے۔''

اس وجہ سے وہ کھانا کھانے کے بعد سونے کے لیے نہیں گیا۔ دونوں کو اس سے کوئی اہم بات کرنی ہے! اس بات نے اس کے دماغ میں ہلچل ضرور مچا دی تھی ....لیکن وہ لاکھ کوشش کر کے بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ ایسی کون سی اہم بات ہے جو وہ اس سے کرنا چاہتے ہیں۔

اور دونوں بھائی ایک ساتھ اس سے کوئی اہم بات کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہال میں آبیٹھا تو موہن اور سندر بھی آگئے۔ ان کے ساتھ ان کی بیویاں بھی تھیں۔

مالتی بھی آکر بیٹھ گئی اور انھوں نے ماں کو بلا لیا۔

''کیا بات ہے؟ ایسی کون سی بات ہے، جو تم مجھ سے کرنا چاہتے ہو۔''

''بھائی! تم دیکھ رہے ہو ہمارے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔'' موہن بولا.........

''بچے تو بڑے ہوتے ہیں؟ اس میں کونسی عجیب بات ہے؟''

''بڑے ہو رہے ہیں اس کا مطلب ہے ان کے خرچ بڑھ رہے ہیں، ان کو اچھی تعلیم، اچھے کپڑے، اچھا رہن سہن ہم کچھ بھی تو نہیں دے پا رہے ہیں۔ میں کرانے کی دکان میں ۱۲ر گھنٹے کام کرتا ہوں تو مجھے مشکل سے دو ہزار روپیہ مہینہ مل پاتا ہے۔ ان دو ہزار روپیوں میں اپنا خرچ چلاؤں.........گھر کا خرچ دیکھوں کہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کروں۔ سندر کی حالت بھی مجھ سے الگ نہیں ہے۔ وہ ایک بلڈنگ میٹریل سپلائی کی دکان پر کام کرتا ہے اسے بھی دو ہزار سے زیادہ نہیں ملتے ہیں۔ آخر یہ کب تک چلتا رہے گا۔ کیا ہم زندگی بھر اسی طرح کی زندگی گذارتے رہیں گے؟''

''تو تم لوگوں کا مطلب کیا یہ ہے کہ میں اور میرے بیوی بچے تم لوگوں سے اچھی زندگی گذار رہے ہیں؟''.....اس نے تیز نظروں سے دیکھا۔

''نہیں دلیپ قسم سے میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا''....موہن جلدی سے بولا ''میں دیکھتا ہوں تم ہم لوگوں سے زیادہ محنت کرتے ہو۔ چار بجے رات سے اٹھ جاتے ہو۔ اتنی محنت کرتے ہو۔ تمہارے بچے اور بیوی بھی انہی محرومیوں کا شکار ہیں جس کے شکار ہمارے بیوی بچے ہیں۔''

موہن کی بات سن کر اس کے دل پر جو بوجھ تھا اتر گیا۔

''ہمیں اپنا اپنا کوئی بڑے پیمانے پر کام شروع کرنا چاہیے۔ تمہارے پاس تیس چالیس بھینسیں ہوں۔ میری اپنی کرانہ مال سپلائی کرنے کی ہول سیل دکان ہو، سندر کی اپنی بلڈنگ میٹریل سپلائی کرنے کی دکان ہو۔ تو ہماری آمدنی بھی بڑھ جائے گی، ہماری زندگی اور معیار زندگی بھی سدھر جائے گا اور ہمارے بچے اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر پائیں گے اور ایک طرح سے ہماری زندگی

سدھر سکتی ہے۔"

"لیکن اتنے بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے کے لیے اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ اگر کسی وجہ سے کل اچانک پانچ ہزار روپیہ کی ضرورت پڑ جائے تو اس گھر میں کے سارے کونوں کی تلاشی لینے کے بعد بھی پانچ روپیہ نہیں نکل پائے گا۔" دلیپ نے صاف جواب دے دیا۔

"ہمیں اس بات کا علم ہے...! " دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"تو پھر آخر تم لوگ کہنا کیا چاہتے ہو؟" دلیپ انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہمارے پڑوسی رامو کا کھیت ایک کروڑ روپے میں فروخت ہو رہا ہے...." موہن بولا۔

"مجھے پتہ ہے.........."

"اگر ہم اپنے کھیت کا آدھا حصہ بھی فروخت کر دیں تو ہمیں صرف اپنا آدھا کھیت فروخت کرنے سے ایک کروڑ روپے مل سکتے ہیں اور ایک کروڑ روپیہ ہمارے پاس آنے کا مطلب ہے ہماری زندگی سدھر جائے گی" ..... سندر بولا۔

"مجھے پتہ ہے .... سندر!" دلیپ نے کہا ..... "جس بلڈر نے رامو کا کھیت خریدا ہے اس نے مجھے بھی آفر دیا ہے۔ وہ ہمارا پانچ ایکڑ کھیت ایک کروڑ روپے میں خریدنے کے لیے تیار ہے۔"

"دادا.... تو پھر دیر کس بات کی ہے؟" سندر بولا۔

"کس سلسلے میں..........؟"

"آدھا کھیت فروخت کرنے میں۔"

"کھیت کیا ہمارے سسرال والوں کا ہے جو ہم اسے اتنی آسانی سے فروخت کر دیں؟ کھیت ہمارے والد پوشیا اندریا پاٹل ہے اور ہمارا باپ جیتے جی پانچ ایکڑ تو کیا ایک انچ بھی زمین فروخت کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوگا۔"

''آخر وہ ہمارا باپ ہے۔ ہم اسے یہ ساری باتیں بتا کر تیار بھی تو کر سکتے ہیں۔ یہ دیکھ ہمارا گھر کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ بارش میں پورے گھر میں چھت سے پانی ٹپکتا ہے پھر بھی ہم کو اس چھت کے نیچے رہنا پڑتا ہے۔ کسی دن یہ ٹوٹ کر گر جائے گا اور ہم اس کے ملبے میں دفن ہو جائیں گے ''.... موہن کہنے لگا۔

''ماں تم سن رہی ہو؟'' سندر نے ماں سے کہا۔

''ہاں .... سن رہی ہوں'' .... رکمنی نے جواب دیا۔

''کیا ہماری باتیں غلط ہیں؟''

''نہیں! تمہاری باتیں غلط نہیں ہے۔ تمہاری باتیں سولہ آنے سچ ہیں'' رکمنی نے جواب دیا۔

''پھر تمہارا کیا جواب ہے؟'' دونوں نے رکمنی سے پوچھا۔

''میرا وہی جواب ہے جو دلیپ کا جواب ہے۔ تمہارا باپ ایک انچ زمین فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔''

''لیکن ماں تم تو انھیں سمجھا سکتی ہو.............؟''

''میں اسے دنیا کی ہر بات سمجھا سکتی ہوں لیکن کھیت فروخت کرنے کی بات نہیں سمجھا سکتی ہوں'' ...... رکمنی نے صاف کہہ دیا۔

''ایک بار تمہیں کوشش کر کے تو دیکھنا چاہیے۔''

''تم ایک بار کہتے ہو .... تم چاہو تو میں تمہارے باپ کو تم لوگوں کے سامنے دس بار سمجھانے کو تیار ہوں لیکن مجھے پورا یقین ہے وہ ٹس سے مس نہیں ہوگا۔''

''اس کا یہی کہنا ہے یہ ہمارے پرکھو کی زمین ہے۔ ہم اس میں اضافہ نہیں کر سکتے تو اسے فروخت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔''

''ماں تم ایک بار کوشش کر کے تو دیکھو ہو سکتا ہے بابا تم سے مان جائیں۔''

"مجھے پورا یقین ہے بابا میری بات نہیں مانے گا پھر تم لوگوں کے لیے تمہارے سامنے اس سلسلے میں بات کرتی ہوں" ..... رکمنی بولی۔

"جاؤ اپنے بابا کو بلا کر لاؤ۔"

رکمنی کی بات سن کر سندر پوشیا کو بلانے کے لیے چلا گیا۔

پوشیا اس وقت وہاں آئے گا اور ان کی بات سنے گا دلیپ کو اس بات کا یقین نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ پوشیا اس وقت سدھ میں نہیں ہوگا۔ شراب پی کر نشے کی دھت میں سو رہا ہوگا۔ اسے حالت میں جگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

پوشیا کا روزانہ کا معمول تھا، وہ دن بھر کھیت میں اور طبیلہ میں کام کرتا رہتا تھا۔ شام ہوتے ہی ایک دیسی شراب کی بھٹی پر جاتا تھا اور اس کے پاس جتنے پیسے ہوتے تھے اتنے پیسوں کی شراب پی جاتا تھا۔ وہ رکمنی سے روز اپنے خرچ کے لیے دس روپے لیا کرتا تھا۔ اس کی بیڑی وہ لا کر دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی ہفتے میں ایک ادھ بار پوشیا کو سو پچاس روپیہ دے دیتا تھا۔ بہت زیادہ ضرورت پڑتی تو وہ موہن اور سندر سے بھی دس بیس روپیہ مانگ لیتا تھا۔

پوشیا کے پیسے مانگنے پر وہ چپ چاپ اسے پیسے دے دیا کرتے تھے کیونکہ اسے پیسہ نہ دینا آفت مول لینا ہوتا تھا۔ کسی نے پوشیا کو پیسے دینے سے انکار کیا تو پوشیا اپنے آپ میں نہیں رہتا تھا اور اس کے منہ سے گندی گندی گالیوں کا طوفان ابلتا تو وہ طوفان گھنٹوں میں تھمتا تھا۔ بہت زیادہ غصہ آتا تو کہنے لگتا... "یہ کھیت میرا ہے... چلو تم لوگ میرے گھر سے نکلو" .....اور کبھی کبھی تو ان کا سامان، کپڑے، غیرہ بھی گھر سے باہر پھینکنے لگتا۔

رکمنی روتی تو اسے نہ صرف گالیاں دیتا بلکہ ان سب کے سامنے رکمنی کو جانوروں کی طرح مارنے لگتا تھا۔ ایسے ہی جو بھی اسے روکنے جاتا اس کو مارنے لگتا۔ اس لیے وہ پوشیا کی کسی بھی بات کا انکار نہیں کرتے تھے۔ انھیں پتہ تھا پوشیا کو صرف شراب پینے کا شوق ہے اور بھی دن میں دس بیس

روپے سے زیادہ نہیں پیتا تھا۔

اس کے جسم پر کپڑوں کے نام پہ صرف ایک لنگوٹی سے ہوتی تھی۔ اس لنگوٹی میں وہ دن بھر کھیتوں اور دلیپ کے طبیلہ میں کام کرتا رہتا تھا۔ کہیں جانا ہوتا تو اس لنگوٹی کے اوپر شرٹ پہن لیتا تھا۔ وہ کبھی بیمار نہیں پڑتا تھا۔ طبیلے کے پاس اس کی ایک چارپائی تھی۔ بارش، گرمی، سردی یہ موسم میں وہ گھر سے باہر اسی چارپائی پر سوتا رہتا تھا۔ وہ آج تک بیمار نہیں پڑا تھا۔ کبھی کبھی ہلکی کھانسی یا سردی ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے اسے بخار بھی آجاتا تھا لیکن وہ کبھی بھی اپنی بیماری یا علاج کے لیے دواخانے یا کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا تھا۔

اگر وہ بیمار ہوتا تو کثرت سے شراب پینے لگتا تھا۔ وہ شراب کو دوا سمجھ کر کچھ زیادہ ہی شراب پیتا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اچھا بھی ہو جاتا تھا۔ شراب کے اڈے سے شراب پینے کے بعد وہ اپنی چارپائی پر بیٹھتا اور بہوؤں میں سے کسی بہو یا رمنی کو کھانا لانے کے لیے آواز دیتا۔ وہ اسے کھانا دیتی۔ وہاں پر ہی کھانا کھاتا اور چپ چاپ چارپائی پر سو جاتا۔ پھر سویرے سب سے پہلے جاگ کر اپنے کاموں میں لگ جاتا تھا۔

دلیپ کو اندازہ تھا کہ اس وقت وہ شراب کے نشے میں چور بے خبر سویا ہوگا۔

اس وقت مشکل سے جاگے گا اور جاگ گیا بھی تو ہوش میں نہیں ہوگا۔ بہتر یہی تھا کہ اس معاملہ کو کسی اور وقت کے لیے ٹال دیا جاتا۔ لیکن اب ممکن نہیں تھا۔ دن میں تو ان میں سے کوئی بھی گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ سب رات میں ہی گھر میں ہوتے تھے اور رات میں پوشیا بات کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔

اس لیے اسی وقت اس سلسلے میں گفتگو ہو جائے یا کوئی فیصلہ ہو جائے تو بہتر ہے۔

سندر کسی طرح پوشیا کو جگا کر گھر میں لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

پوشیا نے آتے ہی سب کو گالیاں دینی شروع کر دی تھی۔

”اچھی گہری نیند سو رہا تھا۔ حرامی، کتے، کمینوں سے میری نیند ہی نہیں دیکھی جاتی۔ نیند سے جگا دیا۔ اب کمینو..... بولو میری نیند کیوں خراب کی۔“

”رامو نے اپنا کھیت ایک کروڑ روپئے میں فروخت کر دیا ہے“ .... دلیپ بولا۔

”تو میں کیا کروں..... اس کمینے کا کھیت تھا اس نے بیچ دیا ہوگا۔“

”ہمارے آدھے کھیت کی قیمت ایک کروڑ لگی ہے“ موہن بولا.... ”بابا! اگر ہم اپنا صرف اور صرف آدھا کھیت فروخت کر دیں تو ہمارے پورے خاندان کی زندگی سدھر جائے گی۔ دلیپ تیس چالیس بھینسوں کا طبیلہ ڈال لے گا۔ میں شہر میں کرانے کی ہول سیل کان کھول لوں گا کیونکہ مجھے اس لائن کا تجربہ ہے۔ سندر بھی بلڈنگ میٹریل سپلائی کی دکان میں کام کرتا ہے۔ اسے بھی اس کام کا اچھا تجربہ ہے وہ بھی اس طرح کی اپنی دکان کھول لے گا تو ہماری زندگی آرام سے کٹے گی۔ ہمارے بچے اچھی تعلیم حاصل کریں گے۔ ہمارا گھر ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اس کی جگہ ہم ایک اچھا سا بنگلہ بنالیں گے جس میں ہم آرام سے رہیں گے اور پھر ہمارے پاس آدھا کھیت تو ہوگا ہی اس میں ہم کھیتی کرتے رہیں گے۔“

”حرام زادو! اگر میرے کھیت کو فروخت کرنے کی بات زبان سے بھی نکالی تو ایک ایک کو کاٹ ڈالوں گا۔ یہ کھیت میرے باپ دادا کی نشانی ہے۔ میں اس میں اضافہ نہیں کر سکا تو مجھے اسے بیچنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ میں اس کھیت کا پانچ ایکڑ تو کیا پانچ انچ زمین بھی نہیں بیچوں گا۔ اگر کسی نے اس کی ہمت کی تو میں اسے کاٹ ڈالوں گا۔ اس کے ٹکڑے کر دوں گا۔“

اور اس کے بعد پوشیا کے منہ سے جو گالیوں کا طوفان ابھرا تو انھیں اپنی جان بچانی مشکل ہوگئی۔ سب نے خیریت اسی بات میں سمجھی کہ چپ چاپ وہاں سے چلے جائیں۔ سب چپ چاپ اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر تک پوشا گالیاں دیتا رہا اور پھر جا کر سو گیا۔

☆☆

○

دوسرے دن جب وہ دودھ فروخت کر کے آیا تو اس نے موہن اور سندر کو گھر میں ہی پایا۔ دونوں کو دیکھ کر اس کی بھنوئیں تن گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ رات کی میٹنگ کا اثر ہے۔ دونوں کے چہروں پر ایک تناؤ تھا۔

"کیا بات ہے تم دونوں کام پر نہیں گئے ...؟" اس نے دونوں سے پوچھا۔

"ہم نے کام چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں....؟"

"جانوروں کی طرح محنت کر کے بھی دو وقت کی روٹی جو نام نہ دے سکے اس کام کو کرنے سے کیا فائدہ ؟"

"تو پھر کیا بھوکے مروگے؟"

"کروڑں کی جائداد ہوتے ہوئے اگر مقدر میں بھوکے مرنا لکھا ہے تو بھوکے ہی مریں گے۔"

"کروڑوں کی جائداد تمہاری نہیں ہے..... تمہارے باپ کی ہے...... اس وقت وہ اس کا مالک ہے۔"

''اس میں ہمارا بھی حق ہے۔''

''اس کے مرنے کے بعد.........!''

''باپ کے مرنے سے پہلے ہم مر جائیں گے۔'' دونوں جلی کٹی سنانے پر اترے تھے۔

اتنے میں رکمنی بھی آ گئی۔

''ماں! ان کو سمجھا...... دیکھ انھوں نے اپنا کام چھوڑ دیا ہے۔ کام نہیں کریں گے تو زندگی کیسے گزاریں گے...؟''

''بیٹا! ان کا کہنا بھی درست ہے۔'' رکمنی بھی ان کی طرف داری کرنے لگی۔ ''بیچارے اتنی محنت کرتے ہیں اور ان کو کیا ملتا ہے؟ اگر ان کا اپنا دھندہ ہے تو دو پیسے کمائیں گے اور شان سے رہیں گے۔''

''دکان شروع کرنے کے لیے دھندہ شروع کرنے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ یہ کوئی دو چار ہزار روپئے کی بات تو ہے نہیں؟'' اس نے غصے سے کہا۔

''سب کچھ سدھر جائے گا اگر تمہارا بابا راضی ہو جائے۔'' دونوں کے دل کی بات آخر رکمنی کے ہونٹوں پر بھی آ گئی۔

''تو ٹھیک ہے تم ہی بابا کو سمجھاؤ۔'' اس نے کاندھے اچکائے۔

''دیکھتے ہیں ایک بار دن میں اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ رات میں تو وہ نشے میں دھت تھا۔ ہوسکتا ہے دن میں نشے میں نہ ہونے کی وجہ سے کچھ اس کی سمجھ میں آ جائے...'' رکمنی بولی۔

اسی وقت گھر میں مہمان آ گئے۔

مہمان عورتیں تھیں۔ کبھی وہ ان کے پڑوس میں ہی رہتے تھے مگر اب کھیت فروخت کر کے شہر میں منتقل ہو چکے ہیں۔ دلیپ کی آنکھیں ان عورتوں پہ ٹک سی گئیں۔ وہ حیرت سے انھیں دیکھنے لگا۔

سبھی عورتیں نہ اس کی دیکھی بھالی تھیں بلکہ اس کی ان سے بات چیت بھی تھی لیکن اس وقت ان کا رنگ روپ کچھ اتنا بدلا ہوا تھا کہ ان سے بات کرتے ہوئے اسے جھجھک محسوس ہو رہی تھی۔

سبھی عورتوں کے بال جدید طرز کے سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ جسم پر قیمتی بناری ساڑیاں تھی جن کی قیمت ۱۰ ہزار سے زائد ہوگی۔

ہاتھوں میں سونے کے کنگن اور چوڑیاں تھیں۔ کانوں سے بڑے بڑے سونے کے جھمکے لٹک رہے تھے۔

گلے میں دو تین بڑے بڑے سونے کے ہار تھے۔

پہلی نظر میں ان کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کا تعلق کسی بڑے گھرانے یا خاندان سے ہے۔ لیکن جیسے ہی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی تھیں سارے بھرم ٹوٹ جاتے تھے۔ ہونٹوں سے وہی دیہاتی کرخت زبان اور کرخت الفاظ نکالتے تھے جیسا عام دیہاتی عورتیں بولتی ہیں۔

مالتی، موہن اور سندر کی بیویاں بھی آگئیں اور ان سے باتیں کرنے لگیں۔ زیادہ تر باتیں کپڑے اور زیور کے بارے میں ہو رہی تھیں۔ یہ ہار اتنے کا ہے، ساڑی کی قیمت اتنی ہے یہ کنگن اتنے روپیوں کے ہیں۔ دلیپ نے محسوس کیا اس کے گھر کی عورتیں بڑی حسرت سے ان کے ایک ایک زیور کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اس کی ماں رکمنی اور اس کی بیوی مالتی بھی شامل تھیں۔

وہ سوچنے لگا۔ ان کا حسرت سے ان زیورات کو دیکھنا بھی فطری بات ہے۔ ان لوگوں کو زندگی میں ایک عام سا منگل سوتر بھی نصیب نہیں ہو سکتا تو بھلا سونے کے ہار اور کنگن کے بارے میں وہ کیا سوچتیں۔ پہننے کے نام پر ان سبھی کے پاس صرف ایک ایک اچھی ساڑی تھی جو شادی بیاہ یا دوسری تقریبات کے موقعوں پر پہنی جاتی تھیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں اور وہ ان کی باتوں کو کان لگائے غور سے سن رہا تھا۔

ان کی باتوں سے ایسا محسوس ہوتا تھا ان کے جسم پر کم سے کم پانچ پانچ لاکھ کے زیورات ہیں اور ان کی الماریوں میں دو دو لاکھ روپیوں کی قیمتی ساڑیاں ہوں گی۔ شہر کے ایک اعلیٰ درجے کے علاقے میں ان کے فلیٹ تھے۔ ان کے بچے انگریزی اسکولوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

انھوں نے ایک سال قبل ابھی ساری زمین دو کروڑ روپیوں میں فروخت کی رتھیں اور شہر منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے شوہر جو پہلے کھیتوں میں کام کرتے تھے اب ان کا اپنا کاروبار ہے۔ وہ تین عورتیں وہاں تک اپنی اپنی کار میں آئی ہیں۔ کار کے ڈرائیور ان کا باہر انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے شوہروں سے دلیپ اچھی طرح واقف تھا۔ جب بھی انھیں سو دو سو روپیوں کی ضرورت پڑتی تھی وہ دلیپ سے ہی ادھار لیتے تھے۔ آج ان کی یہ کایا پلٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''بابا کہاں ہیں...؟'' عورتیں پوچھنے لگیں تو جیسے سندر کو بہانا مل گیا۔

''کھیت میں ہوگا میں ابھی اسے بلا کر لاتا ہوں۔'' کہتا وہ تیزی سے گیا اور تھوڑی دیر کے بعد پوشیا کو لے آیا۔ عورتوں نے پوشیا کے پیر چھوئے۔

''ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو ؟'' پوشیا گھبرا گیا۔

''بابا آپ ہمارے بڑے ہیں۔''

''مگر تم کون ہو؟ '' پوشیا انھیں پہچان نہیں سکا۔

''بابا مجھے پہچانا نہیں.....میں مدھو ہوں........ بارکیا کی بہو.......''

''ارے مدھو تو ہے.....تو تو اتنی بدل گئی ہے کہ میں تجھے پہچان ہی نہیں سکا....ارے تو تو بارکیا کی بہو نہ لگ کر کسی کروڑ پتی مارواڑی گجراتی کی عورت لگتی ہے۔'' پوشیا کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرے۔

''سب تمہارا آشیرواد ہے، بابا'' مدھو بولی..... ''یہ اندو ہے اور یہ شانتی''

''جیتی رہو، جیتی رہو'' .....دونوں نے پوشیا کے پیر چھوئے تو اس نے ان کے سر پر ہاتھ

پھیرے۔ ''لیکن تم تو ایک دم بدل گئی ہو...... یہاں رہتی تھیں تو جسم پر دیہاتی طرز کے معمولی کپڑے ہوتے تھے۔''

لیکن یہ کایا پلٹ............

''بابا! کھیت دو کروڑ میں بیچ دیا۔ شہر جا کر رہنے لگے۔ وہاں نیا کاروبار شروع کیا اور بس محنت کرتے گئے۔ ترقی ہوتی گئی''........ اندو نے جواب دیا۔

اس کی بات سن کر پوشیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ عورتیں تھوڑی دیر بعد چلی گئیں۔ انھیں اور کسی سے ملنے جانا تھا۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سب چپ چاپ بیٹھے اپنے خیالوں میں گم تھے۔

''بار کیا شہر جا کر اتنا بڑا آدمی بن گیا؟'' اچانک پوشیا بڑبڑایا۔ ''شہر جا کر بار کیا سیٹھ ہو گیا..... یہ سب کیسے ہوا؟...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''بابا یہ سب ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے''...... سندر بولا... ''آپ بھی پوشیا سے پوشیا سیٹھ بن سکتے ہیں۔''

''مالتی، ماں، وسندھرا اور کلپنا کے جسم پر بھی ایسے ہی گہنے اور قیمتی کپڑے آ سکتے ہیں''....... سندر بولا۔

پوشیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ دونوں کا منہ دیکھنے لگا۔ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

''تمہارے ساتھ زندگی کے چالیس سال کاٹ دیئے۔ ان چالیس سالوں مین مجھے سونے کا ایک تار تو دور جسم پر چاندی کا یک چھوٹا سا گہنا بھی نصیب نہیں ہو سکا۔ زندگی بھر ایک ایک پیسہ جوڑ کر دونوں بیٹیوں کی شادیاں کیں، بس زندگی کی یہی ایک کمائی ہے''..... اس بار رکمنی کی باری تھی۔

پوشیا چپ تھا..... وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ ان کی باتوں کو اور باتوں کا مقصد بھی سمجھ رہا تھا۔ اگر شراب کے نشے میں ہوتا تو اس مقصد کو سمجھتے ہی انھیں گالیاں دینا شروع کر دیتا تھا لیکن وہ اس وقت نشے میں نہیں تھا۔

......وہ بارکیا کے بارے میں جانتا تھا۔

......بارکیا کی مالی حالت اس سے بدتر تھی۔

......لیکن آج وہ بارکیا سیٹھ ہو گیا تھا۔ وہ بارکیا کے پیروں کی دھول بھی نہیں ہے۔

''تم لوگ کیا کہنا چاہتے ہو، یہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ یہی نا کہ میں بھی بارکیا کی طرح اپنی زمین فروخت کردوں۔ بارکیا نے اپنی زمین فروخت کر دی اور آج بارکیا سے بارکیا سیٹھ بن گیا لیکن بارکیا اور پوشیا میں فرق ہے۔ بارکیا کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ وہ جو زمین فروخت کر رہا ہے اس کی اپنی نہیں اس کے باپ دادا کی ہے اور پوشیا کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ زمین اس کی اپنی نہیں ہے اس کے باپ دادا کی ہے۔ اس کے باپ دادا نے محنت سے یہ زمین خریدی تھی۔ پوشیا زندگی میں اس میں اضافہ نہیں کر سکا تو اسے اس زمین کو فروخت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کی محنت سے کمائی زمین کی حفاظت کرے۔''

''لیکن بابا! ہم پوری زمین فروخت کرنے کی کہاں بات کر رہے ہیں''...اب باری دلیپ کی تھی۔ ''صرف آدھی زمین فروخت کرنے کی بات کر رہے ہیں، آدھی زمین ہمارے پاس رہے گی۔ آدھی زمین فروخت کرنے کے بعد ہم جو نئے کاروبار شروع کریں گے اس میں ہمیں دو پیسے مل گئے تو ہم ان پیسوں سے اور زمین خرید لیں گے۔ حساب برابر ہو جائے گا۔''

''اپنی بہوؤں اور بارکیا کی بہوؤں میں فرق محسوس کرو۔ بارکیا کی بہوئیں مہارانیوں کی طرح رہتی ہیں اور تمہاری بہوئیں آج بھی عام عورتوں کی طرح کھیت میں کام کرتی ہیں اور معمولی کپڑے پہنتی ہیں۔ بارکیا کے پوتے انگریزی اسکولوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بڑے ہو کر وہ انجینئر، ڈاکٹر بنیں گے اور تمہارے پوتے پوتیاں؟ وہ آج بھی گاؤں کی مراٹھی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ گاؤں کی سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کر کے وہ کس طرح ڈاکٹر اور

انجینئر بن سکتے ہیں؟ بڑے ہو کر وہ بھی موہن، سندر کی طرح چھوٹی موٹی نوکریاں کریں گے یا پھر رکشا چلائیں گے۔ تمہاری پوتیوں کی شادیں بھی معمولی گھرانوں میں ہوں گی اور وہ بھی ہماری طرح دن بھر کھیتوں میں کام کریں گی اور اسی طرح ان کی زندگی بسر ہو جائے گی۔''

پوشیا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے۔

''نہیں...... میں نے اپنے بچوں کو تو اچھی زندگی نہیں دی ہے...... مگر میں نہیں چاہتا کہ میرے پوتے اور پوتیوں کو بھی ویسی ہی زندگی ملے۔ میں ان کو اچھی زندگی دینا چاہتا ہوں۔ چاہے مجھے اس کے لیے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اپنے اصولوں کا گلا کیوں نہ گھوٹنا پڑے ٹھیک ہے ...... اگر میرے زمین کے ایک ٹکڑے کو فروخت کرنے سے میرے پوتے پوتیوں کی اور ہم سب کی زندگی سدھر سکتی ہے تو میں یہ قربانی دینے کو تیار ہوں لیکن میری ایک ہی شرط ہے۔ اس زمین کے فروخت ہونے سے جو پیسے آئیں گے ان سے ایسا کچھ کیا جائے جس کی وجہ سے میرے پوتے، پوتیوں کی زندگیاں سدھر جائے۔ وہ دلیپ، موہن اور سندر نہ بن سکیں۔''

پوشیا دہاڑیں مار مار کر بچوں کی طرح رو رہا تھا......

لیکن اس کے رونے اور آنسوؤں کی کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ سب کے چہرے پھول کی طرح کھل گئے تھے۔ ان کے چہروں پر خوشیاں رقصاں تھیں۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اپنی اس کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔

دوسرے دن دلیپ من سکھ کے آفس پہنچا۔

اس دن وہ دودھ فروخت کرنے نہیں گیا تھا۔ اس نے سندر کو دودھ فروخت کرنے کے لیے بھیج دیا تھا کیونکہ اسے من سکھ کے پاس جانا تھا۔ من سکھ کے آفس میں شام بھی ہو سکتی تھی۔ دودھ فروخت کرنے کے جھمیلے میں اگر وہ پھنس جاتا تو اس کا یہ سب سے اہم کام رہ جاتا تھا۔ سندر اور موہن گھر پر ہی تھے۔

انھوں نے اپنی نوکریاں چھوڑ دی تھی۔ اس لیے اس نے سندر کو ابراہیم بھائی کی دکان پر دودھ دینے بھیج دیا تھا۔ سندر ابراہیم بھائی کو جانتا تھا اور ابراہیم بھائی بھی سندر کو اچھی طرح پہچانتا تھا کہ یہ دلیپ کا بھائی ہے۔

کبھی کبھی جب دلیپ کسی کام سے شہر کے باہر جاتا تھا تو دودھ فروخت کرنے کی ذمہ داری سندر پر ہی آتی تھی اور دلیپ اتنا اہم کام کرنے جارہا تھا کہ اس کے لیے تو دونوں بھائی یہ ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ گھر سے نکلتے ہوئے وہ ایک بار پھر پوشیا سے ملا۔

''بابا! میں من سکھ سیٹھ کے پاس زمین کے سودے کی بات کرنے جارہا ہوں۔''

''جا بیٹے.... '' اس کی بات سن کر پوشیا نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا..... ''جا.. شاید قدرت کو یہی منظور ہے۔''

''تم زمین کی اس فروخت کے لیے راضی ہونا؟''

''اب میرے راضی ہونے اور میری مرضی کی کیا اہمیت ہے۔ جس کام میں سارا گھر راضی ہے میں بھی راضی۔ جس کام کے لیے سارا گھر خوش اس کام سے میں بھی خوش......''

''تم زمین کے کاغذات پہ اپنی مرضی سے انگوٹھا لگاؤ گے نا.... یا پھر مکر جاؤ گے...؟''

''نہیں نہیں..... میں اپنی بات سے مکروں گا نہیں۔ زمین کے فروخت کے کاغذات پر اپنی مرضی سے انگوٹھا لگاؤں گا۔''

پوشیا نے کہا تو دلیپ کو اطمینان ہوا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر پوشیا پھر مکر گیا اور اس نے زمین فروخت کرنے سے انکار کر دیا تو پھر معاملہ بگڑ جائے گا اور من سکھ سیٹھ سے بات کرنے کے بعد پوشیا مکر جائے گا تو معاملہ اور بھی زیادہ خراب ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ کوئی خطرہ نہیں مول لینا چاہتا تھا۔ اس لیے من سکھ سیٹھ کے پاس جانے سے پہلے اس نے پوشیا سے دوٹوک بات کر کے اس کی مرضی جان لینا ضروری سمجھا۔ پوشیا کا مثبت جواب سن کر اسے بے حد خوشی ہوئی کہ پوشیا اپنی مرضی اور خوشی سے یہ زمین فروخت کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس لیے آگے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہو سکتا ہے

ورنہ پوشیا کو سمجھانا اور اس سے کوئی بات منوانا جوئے شیر لانے کے مصداق ہے۔

من سکھ اسے دیکھتے ہی پہچان لیا... ''آؤ! دلیپ کیا بات ہے..... بہت جلدی آ گئے.....''

''ہاں! اس دن رات میں ہی گھر میں مشورہ کیا اور گھر والے اس بات کے لیے تیار ہو گئے۔''

''زمین کے کاغذات لائے ہو؟''

''ہاں!'' ..... کہتے ہوئے اس نے زمین کے کاغذات ١٢۔ ے من سکھ کی طرف بڑھا دیے۔

من سکھ کی مشاق نظریں کاغذات کا باریکی سے جائزہ لینے لگیں۔

''پوشیا اندیا پاٹل تمہارے والد ہیں نا؟''

''ہاں!''

''وہ زمین کے فروخت کے کاغذات پر مرضی سے انگوٹھا لگائیں گے نا؟''

''ہاں!''

''نہیں... میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے اس بات کا خاصا تجربہ ہے، اولاد تو زمین فروخت کرنے کے لیے تیار ہوتی ہے لیکن ماں باپ تیار نہیں ہوتے۔''

''سیٹھ! جب میرا باپ تیار نہیں تھا اس وقت میں نے آپ سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمیں زمین فروخت نہیں کرنی ہے۔ اب میرا باپ زمین فروخت کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے.... کوئی بات نہیں'' .... من سکھ بولا.... ''دام تو پہلے ہی طے ہو چکے ہیں۔ بیس لاکھ روپیہ ایکڑ..... مجھے پانچ ایکڑ چاہیے۔ سنا ہے تمہاری زمین زیادہ ہے اس لیے اگر تم زیادہ بھی بیچنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''نہیں مجھے صرف پانچ ایکڑ زمین فروخت کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے..... رجسٹری آٹھ دن دنوں میں ہوں گی۔ اس دوران میں زمین کی پیمائش

کرنا چاہتا ہوں کہ کہاں تک زمین میرے حصے میں آئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں..........ہم تیار ہیں۔''

''لیکن ہم زمین کو ایگریمنٹ کر لیتے ہیں تاکہ دس دن کے بعد نہ تو تم اپنی زبان بدل سکو اور نہ میں......''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں مکر نہیں سکتا کیونکہ مجھے تو زمین فروخت کرنی ہے'' دلیپ بولا۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں ایک لاکھ روپیہ پیشگی دے دیتا ہوں اور تمہارے ساتھ ایک ایگریمنٹ بنا لیتا ہوں۔ دس دن بعد جو رجسٹری ہوگی وہ تمہارے والد کے ساتھ ہوگی''..... من سکھ بولا۔

''جی!''.....دلیپ کے جسم میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ آج اسے ایک لاکھ روپیہ ملنے والا ہے۔

من سکھ نے اپنے سکریٹری کو دلیپ کے زمین کے کاغذات دیئے اور کہا ''ان کاغذات کی بنیاد پر زمین کے مالک کے بیٹے دلیپ پوشیا پاٹل کے ساتھ ایک لاکھ روپیہ کا پیشگی قرارنامہ تیار کرو۔''

ایک گھنٹے کے اندر قرار نامہ تیار ہو گیا۔ ایگریمنٹ پر دلیپ نے دستخط کر دیئے اور من سکھ نے بھی گواہی کو طور پر آفس میں موجود دو لوگوں کے دستخط کرا لیے تھے۔

من سکھ نے ایک لاکھ روپیہ دلیپ کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ ایک لاکھ روپیہ ہاتھوں میں آتے ہی دلیپ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کے پاس زندگی میں کبھی ایک لاکھ روپیہ نہیں آیا تھا۔ ایک لاکھ روپیہ اس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے ایک لاکھ روپیوں کے سو سو کی نوٹوں کے بنڈل اپنی تھیلی میں ڈالے اور تھیلی کو سائیکل پر لٹکا کر سیدھے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے پوشیا کو آواز دی۔ گھر میں رکمنی، موہن، سندر دونوں کی بیویاں سبھی اس کی راہ

دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہوا ؟'' سب اس سے تجسس سے پوچھنے لگے۔

''کام ہو گیا ہے'' ...... اس نے جواب دیا۔ اس دوران پوشیا بھی آ گیا۔

''کیا بات ہے دلیپ بیٹے!'' پوشیا نے بڑی شفقت سے پوچھا۔

''بابا!.... میں نے زمین کا سودا کر دیا ہے۔ دس دنوں کے بعد رجسٹری ہے۔ رجسٹری پہ آپ کو انگوٹھا لگانا ہے۔ یہ رہے پیشگی میں ملے ایک لاکھ روپے'' ..... کہتے ہوئے اس نے ایک لاکھ روپیہ پوشیا کے ہاتھوں میں رکھ دیئے۔ ان روپیوں کو دیکھ کر پوشیا کے چہرے پر کوئی جذبات نہیں ابھرے۔ وہ خالی خالی نظروں سے نوٹوں کے بنڈل کو دیکھتا رہا۔ جبکہ نوٹوں کے بنڈل کو دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''میں ان روپیوں کا کیا کروں گا'' پوشیا نے کہا..... ''یہ میرے کسی کام کے نہیں ہیں۔ میرا خرچ ہی کہاں ہے؟ مجھے دس روپئے روز کے شراب کے مل جائیں تو ہی میرے لیے کافی ہے'' ...... کہتے ہوئے اس نے نوٹوں کے بنڈل اس کی طرف بڑھا دیئے۔

''ٹھیک ہے ماں..... اب یہ پیسے تم اپنے پاس رکھو'' .... کہتے ہوئے دلیپ نے ایک لاکھ روپیہ رکمنی کی طرف بڑھا دیا۔ رکمنی نے جب ایک لاکھ روپیہ اپنے ہاتھوں میں لیے تو اس کے ہاتھ خوشی سے کانپ رہے تھے۔

☆☆

گھر میں ایک لاکھ روپیہ آیا تھا۔ اس بات سے ہی ہر فرد دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ ہر فرد کی اپنی فرمائش تھی جو رکمنی کے سامنے رکھی جا رہی تھی کیونکہ روپیہ رکمنی کے پاس تھا۔ وہی روپیوں کی مالکن تھی۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ چہرے پہ سرخی آئی تھی۔ وہ اپنے میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اسے اپنے اطراف کا ہوش ہی نہیں تھا۔

وہ اچانک گھر کی مالکن بن گئی تھی اور اس کی بہوئیں بھی اس کے ساتھ ادب سے پیش آنے لگی تھیں۔ وہ اسے گھر کی مالکن اور خود کو اس کی نوکرانی سمجھنے لگی تھیں۔ سویرے ہی سے ہاتھ میں دس ہزار روپئے لیے بیٹھی تھی اور انگلیوں پر پتہ نہیں کیا کیا حساب لگا رہی تھی۔ کسی نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ آخر یہ دس ہزار روپئے لیے کیوں بیٹھی ہے اور انگلیوں پر کیا حساب لگا رہی ہے۔ اچانک اس نے سندر کو آواز دی۔

"آیا ماں!" کہتے ہوئے سندر ادب سے اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ پانچ ہزار روپیہ ہے"......اس نے نوٹوں میں سے آدھی نوٹیں سندر کی طرف بڑھا

دیں اور کہا...... ''ابھی تمام بچوں کو اپنے ساتھ شہر لے جا اور انھیں کپڑے دلا دے۔ شام کو ان جسم پر یہ معمولی اور پرانے کپڑے دکھائی نہیں دینا چاہیے۔ ایک ایک کے لیے دو دو تین تین ڈریس لانا۔ پیسوں کی فکر مت کر۔ اگر کم پڑے تو میں اور پیسے دوں گی۔''

''جی آئی!'' سندر نے کہا اور پھر بچوں کو آواز دینے لگا۔

''کیا بات ہے بابا؟''

''کیا بات ہے کاکا؟''

بچے آکر سندر کے گرد جمع ہو گئے۔

''چلو ہم سب شہر جا رہے ہیں۔ آج تمہارے لیے نئے کپڑے خریدیں گے'' ...... سندر نے بچوں سے کہا۔

یہ سنتے ہی بچوں نے منہ سے ''ہرے'' کا نعرہ بلند لگایا اور خوشی سے ناچنے لگے۔

''کاکا'' ...... بلو جو سب سے بڑا تھا دھیرے سے بولا ''شہر میں ہمیں صرف کپڑے ہی دلاؤ گے؟ آئس کریم اور بھیل پوری نہیں کھلاؤ گے؟''

اس کی بات سن کر رکمنی ہنس پڑی۔

''ارے آج کاکا کے ساتھ شہر جاؤ۔ خوب جی بھر کے شہر کی سیر کرو جو دل میں آئے کھاؤ اور اپنی پسند کے کپڑے خریدو۔ یہ لو سندر خرچ کے لیے ایک ہزار روپیہ اور اپنے پاس رکھ لو'' .... کہتے ہوئے رکمنی نے ہزار روپیہ سندر کی طرف بڑھا دیا۔

''جی ماں!'' کہتے ہوئے سندر نے جلدی سے رکمنی کے ہاتھوں سے ایک ہزار روپیہ لے لیا۔

اس کے بعد رکمنی نے مالتی کو آواز دی۔

''مالتی تو کہاں ہے؟''

''آئی ماں'' ... مالتی کی کچن سے آواز آئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی ساڑی کے

پلو سے ماتھے پر آیا پسینہ اور نم ہاتھ پونچھتی رکمنی کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''یہ ہے پانچ ہزار روپیہ''.....اس نے پانچ ہزار روپیہ مالتی کی بڑھا دیئے اور کہا''تیرے، میرے، وسندھرا اور کلپنا کے لیے ایک ایک اچھی ساڑی آج ہی لے کر آ۔''

''جی ماں''.....مالتی نے جواب دیا۔

رکمنی نے پانچ ہزار روپیہ اس کی طرف بڑھا دیئے۔

مالتی نے چپ چاپ پیسے رکھ لیے۔

''کھانا پک گیا ہے نا؟''

''جی ہاں ماں!''.....مالتی نے جواب دیا۔

''تو جا ابھی شہر جانے کے لیے تیار ہو جا۔ سندر بھی بچوں کو لے کر شہر جا رہا ہے، تو ان کے ساتھ ہی چلی جا اور سن.....اگر وسندھرا اور کلپنا آنا چاہیں تو ان کو ساتھ لے لینا۔''

''جی ماں جی'' مالتی نے جواب دیا اور وہ یہ خوش خبری کلپنا اور وسندھرا کو سنانے اندر کے کمرے میں گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے سے باہر آئی تو اس کے ساتھ کلپنا اور وسندھرا بھی تھیں۔

''ماں.....یہ دونوں بھی میرے ساتھ آنا چاہتی ہیں۔''

''تو جا.....ان کو بھی ساتھ لے جا.....میں نے کب منع کیا ہے۔ میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا اگر وہ ساتھ آنا چاہے تو انھیں بھی ساتھ لے لینا۔ دلیپ، موہن وغیرہ کے کھانے کی تم لوگ فکر مت کرو۔ میں انھیں کھانا دے دوں گی۔ تم لوگ کھانا کھالو.....اگر دل نہیں کہہ رہا ہوگا تو کوئی بات نہیں۔ شہر کی کسی اچھی سی ہوٹل میں کھانا کھالینا''........رکمنی ان سے بولی۔

دلیپ بڑی دیر سے چپ چاپ رکمنی کا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ رکمنی کی ہر حرکت کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ جاتی تھی اور اسے ماں کی اداؤں پر پیار آتا تھا۔

تھوڑی دیر میں سارا گھر خالی ہوگیا۔ بچے سندر کے ساتھ چلے گئے اور مالتی کے ساتھ کلپنا اور وسندھرا۔

اس دن موہن دودھ لے کر گیا تھا، ابھی تک شہر سے واپس نہیں آیا تھا۔ گھر پر صرف مالتی اور پوشیا ہی تھے۔

وہ مالتی کے پاس جا بیٹھا۔

''ماں.... آج تم تو بالکل کسی بڑے گھر کی مالکن لگ رہی ہو''........اس نے رکمنی کو چھیڑا۔

''میں کہاں مالکن ....میں تو سارے گھر والوں کی ماں ہوں اور تم سب میرے بچے ہو۔''

''لیکن آج تم تو کسی مالکن کی طرح برتاؤ کر رہے ہو۔ پیسہ آتے ہی شخصیت میں رعب بھی آ گیا۔''

''دلیپ بیٹے! میں رات بھر چین نے سو نہیں سکی'' ......رکمنی بولی..... ''تو نے کل ایک لاکھ روپیہ لا کر میرے ہاتھ میں دیا تب سے میں یہ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی ہوں کہ ان ایک لاکھ روپیوں کا کیا کروں گی۔''

''ماں! صرف ایک لاکھ روپیہ دیکھ کر پاگل ہوئی جا رہی ہو'' ......دلیپ ہنس کر بولا .... ''آٹھ دن کے بعد تو تمہارے پاس اور ننانوے لاکھ روپئے آنے والے ہیں۔ اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی؟''

''ارے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ ان ایک لاکھ روپیوں نے ہی مجھے پاگل کر دیا ہے تو ننانوے لاکھ تو مجھے سیدھا پاگل خانے میں بھیج دیں گے'' ......رکمنی بولی۔

''پاگل مت ہونا اور پاگل خانے مت پہنچنا'' ......دلیپ ہنس کر بولا..... ''ابھی تمہیں پورے ننانوے لاکھ روپیوں کا حساب کتاب رکھنا ہے۔''

''نا بابا..نا! میں اتنے پیسے اپنے پاس نہیں رکھوں گی میں تو ان اتنے پیسے دیکھ کر ہی پاگل ہو جاؤں گی تو بھلا ان کا حساب کتاب کس طرح رکھوں گی'' .....رکمنی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے

کان پکڑ لیے تو دلیپ زور زور سے ہنسنے لگا۔

گھر کے جو افراد شہر گئے تھے وہ شام کو ہی گھر واپس آ گئے۔ وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں شاپنگ کی بڑی بڑی بیگ تھی۔ انھوں نے سارے بیگ لا کر رکمنی کے سامنے رکھ دیئے اور اپنی خریدی ہوئی چیزیں بتانے لگے۔

''ماں...... یہ تمہاری ساڑی ہے''...... مالتی نے ایک ساڑی رکمنی کو بتاتے ہوئے کہا۔

''واہ! کتنی اچھی ساڑی ہے''........ رکمنی نے ساڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ ساڑی میں اپنے لیے لائی ہوں..... یہ کلپنا کے لیے اور یہ وسندھرا کے لیے''.... مالتی دیگر ساڑیاں بتاتی ہوئی بولی۔

''سب اچھی ہیں، پیسہ تو کم نہیں ہوئے؟''

''نہیں اور بھی کچھ پیسے بچ گئے ہیں۔''

''اچھی بات ہے''...... رکمنی نے اطمینان کا سانس لیا۔

سندر نے بچوں کے لیے دو تین ڈریس لائے تھے۔ رکمنی کے سامنے ان کے کپڑے رکھتے ہی بچے اپنے اپنے کپڑے لے اڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے اپنے کمروں سے ان کپڑوں میں سے ایک ایک کپڑا پہن کر فخر سے سینہ تان کر نکلے۔

''ارے واہ رے میرے بار کیا!''..... دلیپ کے چھوٹے لڑکے کو دیکھ کر رکمنی نے اپنی طرف کھینچا اور اس کے گالوں کو چوم لیا...... ''تو تو راجکمار لگ رہا ہے راجکمار..!'' اس کے بعد بھی بچے باری باری آ آ کر اسے اپنے اپنے کپڑے بتانے لگے۔ رکمنی ان کو دیکھتی اور پھر انھیں پیار کرتی۔

رکمنی کو کپڑے بتا کر بچے اپنے کپڑے پوشیا کو بتانے کے لیے گھر سے باہر بھاگے۔ پورا گھر خوشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے۔ بچے تو سو گئے تھے اور پوشیا بھی شاید سو گیا تھا۔ معمول کے مطابق اس نے شراب پی تھی اور مالتی نے اسے

کھانا دیا تھا۔

کھانا کھا کر وہ اپنی چارپائی پر بے خبر سو گیا تھا۔ اسے ان باتوں سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

''ماں! ابھی تمہارے پاس کتنے پیسے باقی ہیں''.....سندر نے پوچھا۔

''باقی ہیں! سارے پیسے باقی ہوں گے''.....موہن بولا...''خرچ ہی کہاں ہوئے ہیں؟''

''یہ بچوں کے نئے کپڑے، یہ تیری جورو اور بھابیوں کو ساڑیاں کیا تیرے پیسوں سے آئی ہیں؟''.....رکمنی نے کڑک کر کہا....''کس بنیاد پر تو کہہ رہا ہے کہ پیسے خرچ نہیں ہوئے ہیں؟

''ارے ہاں! میں یہ تو بھول ہی گیا کہ تم نے جو اس وقت ساڑی پہن رکھی ہے وہ بھی آج ہی خریدی گئی ہے''......موہن ہنس کر بولا۔

''ماں! تم سے ایک لاکھ روپیہ خرچ نہیں ہو رہا ہے تو بھلا تم ننانوے لاکھ روپیہ کس طرح خرچ کرو گی؟''

''میں نے کہہ دیا نہ وہ پیسے میں نہیں لوں گی۔ اتنے پیسوں کا حساب کتاب رکھنا، اسے سنبھالنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے''.....موہن بولا....''وہ سارے پیسے ہم لوگوں میں بانٹ دینا۔ ہم اپنے پیسوں کا حساب رکھیں گے۔''

''ہاں! تم اپنے اپنے پیسے لے لینا اور خود ہی ان کا حساب کتاب رکھنا''.....رکمنی بولی۔

''ماں ہمیں یہ تو بتاؤ تم کتنے کتنے پیسے دو گی؟'' دلیپ نے پوچھا۔

''جتنے تم چاہو.......''

''اگر میں کہوں کے سارے پیسے مجھے دے دینا تو؟''سندر بولا۔

''تیرے باپ کا راج ہے تو سارے پیسے لے لے گا تو پھر یہ تیرے دوسرے بھائی کیا کریں

گے۔''

''تو پھر بتا..... ہمیں کتنا پیسہ دے گی؟''

''یہ تم لوگ طے کرو۔''

''ہم نے طے کرلیا ہے۔''

''کیا طے کیا ہے؟''

''یہ کہ ہم سب برابر برابر حصہ کریں گے اور اپنے حصے میں جو بھی پیسے آئیں گے وہ لے لیں گے۔''

''حصہ کس طرح کرو گے؟''..... رکمنی نے پوچھا۔

''چار برابر حصے کریں گے۔ ایک حصہ دلیپ لے گا، دوسرا حصہ سندر لے گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے''..... رکمنی بولی.....

''ایک میں'' موہن نے کہا..''اور ایک تم؟''

تم تینوں اور میں سارا پیسہ لے لیں گے۔ کیا تم لوگ اپنے باپ کو پیسہ نہیں دو گے؟''

''ماں ہمیں پتہ ہے بابا ایک پیسہ نہیں لے گا۔ اس لیے ان کا حصہ تم کو دے رہے ہیں۔ اگر بابا اپنا حصہ لینے کے لیے تیار ہو گیا تو پھر پیسوں کے پانچ حصے کریں گے''.... موہن بولا۔

''تمہارا باپ کیا حصہ لے گا یا حصہ مانگے گا''..... رکمنی ٹھنڈی سانس لے کر بولی،''اسے شراب پینے کے لیے روزانہ دس روپیہ مل جائے اس کے لیے یہی کافی ہے۔ اسے کبھی بھی روپیوں پیسوں میں دلچسپی نہیں رہی ہے....''

''اس لیے تو ان کا حصہ تم کو دے رہیں ہیں۔''

''ہاں! لیکن تمہاری بہنوں کا کیا؟ وہ بھی تو برابر کی حصہ دار ہیں''.... اچانک رکمنی کو کچھ یاد آیا۔

''انھیں تم اپنے پیسے میں سے حصہ دے دینا..........''

''ہاں! وہ میری بیٹیاں ہیں۔ انھیں حصہ بھی مجھے ہی دینا پڑے گا''.....رکمنی بولی.... ''اچھا یہ بتاؤ کس کے حصے میں کتنے روپے آئیں گے؟''

''حصے کے حساب سے دلیپ دادا کے حصے میں ۲۵/لاکھ روپیہ.....''موہن بولا۔

''بالکل......دلیپ کو ۲۵ لاکھ روپیہ ملنا ہی چاہیے''......رکمنی نے جواب دیا۔

''میرے حصے میں ۲۵ لاکھ....''

''چلو ٹھیک ہے۔''

''سندر کے حصے میں ۲۵ لاکھ....''

''اچھی بات ہے''.....رکمنی بولی۔

''.....اور تمہارے حصے میں ۲۴/لاکھ روپیہ''

''کیوں کیوں؟''رکمنی تنک کر بولی..... ''سب کو ۲۵/لاکھ روپیہ اور مجھے ۲۴/لاکھ روپیہ کیوں؟''

''ایک لاکھ روپے تمہیں پہلے ہی مل چکے ہیں۔''

''اچھا تو یہ روپیہ بھی میرے حصے میں ڈال دیے گئے۔ آخر خرچ تو تم ہی کر رہے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ایک لاکھ روپیہ کا گھاٹا برداشت کرنے کو تیار ہوں'' رکمنی بولی........

بٹوارے سے سب مطمئن تھے۔

رکمنی مطمئن تھی۔ یہ ان کے لیے تسلی کی بات تھی۔

دودھ دینے کے بعد روزانہ دلیپ من سکھ کی آفس کا چکر لگا آتا تھا۔ من سکھ اسے روزانہ کی تازہ صورت حال سے آشنا کراتا تھا......وکیل کو کاغذات تیار کرنے کے لیے دے دیے ہیں.....وکیل نے کاغذات تیار کر لیے ہیں.....پیسوں کے انتظام میں لگا ہوں.........

''تمہیں نقد روپئے دینے ہوں گے نا!....اس لیے مسئلہ ہے۔ اتنی بڑی رقم جمع کرنے میں وقت جائے گا۔ بینک اتنی بڑی رقم نقد نہیں دیتی ہے اگر چیک چاہیے تو آج ہی رجسٹری کر لیتا

ہوں۔“

من سکھ کی یہ باتیں سن کر دلیپ فوراً کہہ اٹھتا ”نہیں نہیں ... مجھے کیش ہی چاہیے۔ میرے والد کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں ہے۔ پھر اسے اپنی دستخط کرنی بھی نہیں آتی، انگوٹھا لگاتا ہے۔ انگوٹھے سے اتنی بڑی رقم بینک سے نکالنے میں مجھے پریشانی ہوگی۔“

”میں بھی اتنی بڑی رقم تمہیں چیک نہیں دے سکتا۔“ من سکھ دل ہی دل میں سوچتا...” اگر اتنی بڑی رقم تمہیں چیک سے دوں تو مجھے انکم ٹیکس والوں کو اس کا حساب دیتے دیتے ناک میں دم آجائے گا۔ میں بھی تمہارا کھیت اپنے بلیک منی سے خریدنا چاہتا ہوں۔“

ہر بار من سکھ دلیپ سے ایک ہی بات پوچھتا تھا۔

”تمہارا باپ اس سودے سے خوش ہے نا؟ وہ مرضی سے اپنی زمین فروخت کر رہا ہے نا؟ ورنہ پتہ چلا آخری وقت میں وہ زمین فروخت کرنے سے مکر جائے۔“

اس پر دلیپ من سکھ کو سمجھاتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں فکر نہ کرے۔ یہ بات درست ہے کہ اس کا باپ یہ زمین فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے منانا بہت مشکل کام ہے لیکن اب وہ زمین بیچنے کے لیے تیار ہوگیا ہے۔ رجسٹری میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اپنی خوشی سے پوشیا رجسٹری کے کاغذات پر انگوٹھا لگادے گا۔ دن گذرتے جا رہے تھے اور ان کی بیتابیاں اور بے صبری بڑھتی جا رہی تھی۔

ہر کوئی چاہ رہا تھا کہ من سکھ سیٹھ آج زمین کی رجسٹری کرے اور انھیں بقیہ ۹۹/ لاکھ روپیہ دے تاکہ وہ اپنی ایک نئی زندگی شروع کرسکیں لیکن من سکھ رقم جمع کرنے کا بہانہ کر کے ٹال رہا تھا۔ بعد میں جب من سکھ کو محسوس ہوا کہ اس کی طرف سے اس طرح کی تاخیر اس کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ پوشیا موڈی آدمی ہے۔ اس وقت وہ کھیت فروخت کرنے کے موڈ میں ہے۔ اگر اس کا موڈ بدل جائے تو اور وہ زمین کی رجسٹری کے کاغذات پہ انگوٹھا لگانے سے انکار کردے تو اس کے لیے دلیپ سے اپنے پیشگی پیسے وصول کرنا مشکل ہوجائے گا۔

اس لیے اس نے رجسٹری کی تیاریاں شروع کر دیں۔

کل تم اپنے باپ کو لے کر ۱۲ر بجے رجسٹرار کے آفس پہنچ جاؤ۔ دس منٹ کا کام ہے۔ تمہارے پیسے تیار ہیں۔ اس نے دلیپ سے کہا تو دلیپ خوشی سے جھوم اٹھا۔

اس نے گھر والوں کو یہ خبر سنائی کہ کل رجسٹری ہے۔ زمین کے فروخت کے کاغذات پر پوشیا کا انگوٹھا لگتے ہی کل انھیں ۹۹ رلاکھ روپیہ مل جائے گا تو سارے گھر میں خوشی کا ماحول چھا گیا۔

کئی افراد خوشی سے رات بھر نہیں سو سکے۔ ان میں دلیپ بھی شامل تھا۔ رات بھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملنے والے پیسے ان میں ان کا حصہ اور ان روپیوں سے وہ کیا کام کریں گے وغیرہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے، منصوبہ بناتے رہے۔

دوسرے دن دس بجے پوشیا شہر جاکر رجسٹرار کے آفس میں رجسٹری کے کاغذات پر انگوٹھا لگانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے جسم پر معمولی کپڑے پہن رکھے تھے۔ دلیپ نے خاص اس دن کے لیے رجسٹری والے دن کے لیے نئے کپڑے لائے تھے مگر پوشیا نے وہ پہننے سے انکار کر دیا تھا۔

۱۲ر بجے وہ رجسٹرار کے آفس پہنچے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ان کا نمبر آیا۔ زمین کی فروخت کی رجسٹری کے کاغذات پر پہلے من سکھ سیٹھ نے دستخط کیے۔ اس کی تصویر کھینچی گئی۔ پھر پوشیا کی تصویر کھینچی اور آخر میں رجسٹری کے کاغذات پر پوشیا نے انگوٹھا لگا دیا۔

☆☆

○

۹۹ لاکھ گھر میں آئے تھے۔ ایک طرح سے پورے ایک کروڑ روپیہ گھر میں تھا۔ اس خیال سے ہی گھر کے افراد کر نیند نہیں آ رہی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ تھا ان روپیوں کو کہاں رکھا جائے۔ رکھنے کے لائق گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ گھر میں کپڑا رکھنے کی ایک الماری تھی جو کلپنا کے جہیز میں آئی تھی۔ اس کے تمام کپڑے خالی کر دیے گئے اور نوٹوں کے بنڈل اس میں ٹھونس کر تالا مار دیا گیا۔ تالے کی چابی رکمنی کے پاس تھی۔ ہر کسی کے دل میں ڈر تھا۔

اگرِ کسی چور اچکے کو پتہ چل گیا کہ گھر میں ایک کروڑ روپیہ ہے تو؟ ویسے بھی ان کا گھر کھیت میں تھا۔ آس پاس صرف کھیتوں کے سلسلے تھے۔ ان میں کہیں کہیں لوگ رہتے تھے باقی ویران تھے۔ قریب سے جو سڑک گذرتی تھی اس پر ہمیشہ ٹریفک رہتی تھی۔ وہی سڑک سب سے زیادہ خطرہ محسوس ہو رہی تھی۔ لٹیرے گھر میں آئے، گھر پر ڈاکہ مار کر سارا روپیہ لوٹ کر اس سڑک سے کہاں جا سکتے ہیں کوئی نہ تو تصور کر سکتا ہے اور نہ ان کی دھول پا سکتا ہے۔ بظاہر تو گھر کا ہر شخص سونے کی کوشش کر رہا تھا گر نیند کسی کی آنکھوں میں نہیں تھی۔

صرف بچے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ پیسوں کی الماری رکمنی کے کمرے میں تھی۔ وہ

بستر پر لیٹی تھی مگر کروٹ بدل رہی تھی۔ دلیپ موہن، سندر ان کی بیویاں کوئی بھی نہیں سو سکا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے یا کروٹیں بدل بدل کر سونے کی کوشش کرتے۔ جب نیند نہیں آتی تو اٹھ کر رکمنی کے کمرے میں آتے۔ ان کی آہٹ سن کر رکمنی جاگ جاتی۔

''ارے دلیپ تو ابھی سویا نہیں؟''

''موہن تو ابھی جاگ رہا ہے۔''

''سندر تو ابھی تک کیوں جاگ رہا ہے؟ سو جا میں جاگی ہوں۔''

ان کو آوازیں دے کر رکمنی یہ ظاہر کرتی کہ وہ جاگی ہے۔ نیند اسے بھی نہیں آرہی ہے۔ باہر پوشیا گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ اسے ان باتوں اور پیسوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس دن اسے دو سو روپے دیے گئے تھے۔

''آج بدیسی پینا''...... رکمنی نے اسے پیسے دیتے ہوئے کہا تھا۔

''جو مزہ دیسی میں ہے وہ بدیسی میں کہاں...؟'' کہتے ہوئے پوشیا نے رکمنی کو پیسے لوٹا دیے تھے اور بڑی مشکل سے صرف پچاس روپے لیے تھے۔

ان پیسوں کو گھر لانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ رجسٹرار کے آفس سے سندر پوشیا کو لے کر گھر آگیا تھا۔ دلیپ اور موہن من سکھ کے آفس گئے تھے۔ آفس میں من سکھ سیٹھ نے ایک بڑا سا سوٹ کیس ان کی طرف بڑھایا تھا۔

''اس سوٹ کیس میں پورے ۹۹ لاکھ ہیں گن لو.........''

''تم روپیہ لانے کے لیے سوٹ کیس نہیں لائے؟'' من سکھ نے پوچھا۔

''من سکھ سیٹھ ایک دن کے لیے ہمیں یہ سوٹ کیس دے دو۔ میں کل لا کر واپس کر دوں گا'' دلیپ نے کہا۔

''پاگل تو نہیں ہو گئے ہو......... ہر کوئی جانتا ہے کہ اس سوٹ کیس میں کیش لایا جاتا ہے۔

اس کے باہر جاتے ہی چوراچکوں کو پتہ چل جائے گا کہ تم اس میں کیش لے جارہے ہواور تمہاری جان ومال خطرے میں پڑجائے گی۔ مجھے سوٹ کیس دینے میں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے‘‘.........من سکھ بولا تھا۔

یہ بات سن کر دلیپ نے اپنے جانوروں کے خوراک کے لیے جو تھیلے استعمال ہوتے تھے وہ نکالے اوراس میں نوٹوں کے بنڈل بھر لیے۔

یہ دیکھ کر من سکھ کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔شاید اس کے لیے اس طرح کے مناظر نئے یا انوکھے نہیں تھے۔ پوری نوٹیں وہ گن نہیں سکے تھے۔نوٹیں موہن نے گنی تھی کیونکہ اسے اس کام کا تجربہ تھا۔وہ ایک کرانہ کی دکان پر کام کرتا تھا۔

اس نے صرف نوٹوں کے بنڈل گنے تھے اور حساب لگایا تھا۔ پورے ۹۹/لاکھ روپے تھے ۔اب کسی بنڈل میں ایک دو نوٹ کم ہوں تو وہ الگ بات تھی لیکن موہن کو علم تھا نوٹوں کی گڈیوں میں عام طور پر نوٹیں کم نہیں ہوتی ہیں۔ ہاں کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھادی تو وہ الگ بات ہوتی ہے لیکن بدنام تو بینک ہوتی ہے۔

دو تھیلے موہن اور دلیپ نے سائیکلوں پر لادے تھے اور گھر کی طرف چل دیئے تھے۔

اس طرح وہ ہزاروں بار وہ سائیکل پر گاؤں سے آئے گئے تھے لیکن اس دن انھیں بڑی الجھن محسوس ہورہی تھی۔انھیں محسوس ہورہا تھا جیسے ہر راہگیر کی نظر ان کے سائیکل کے کیرئیر پہ بندھے تھیلوں پر ہے۔

دونوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کئی لوگ ان کا تعاقب کررہے ہیں۔اس تصور سے ہی ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی تھی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر جاتی تھیں۔وہ بار بار مڑ کر دیکھتے تھے کہ تعاقب کرنے والا ان کے تعاقب میں کہاں تک پہنچا ہے لیکن وہ جب کسی موڑ پر مڑ جاتا یا کافی پیچھے ہوتا تو اطمینان محسوس ہوتا تھا۔

لیکن یہ اطمینان صرف کچھ لمحوں کے لیے ہوتا تھا۔ ذہن میں اٹھنے والے خدشات اور وسوسوں کا طوفان پھر کسی کے اوپر شک کی سوئی رکھ دیتا تھا۔ اور ایک بار پھر وہی خوف کا عمل شروع ہو جاتا تھا۔ گھر پہنچ کر ہی انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

گھر پہنچے تو ایک نئی مصیبت کھڑی تھی۔

گھر میں دو چار گاؤں کے لوگ گھر والوں سے ملنے آئے تھے۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور نوٹوں کی گڈیوں کے تھیلے کو چپ چاپ لے جا کر کمنی کے کمرے میں رکھ دیا اور مہمانوں سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

مہمان بھی جیسے ان کے صبر کا امتحان لینے کے لیے آئے تھے۔ وہ بار بار انھیں ٹالنے اور مہمانوں سے اشاروں کناروں میں جانے کی بات کہتے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہر کسی کے دل میں یہ جستجو تھی تھیلوں میں کتنی نوٹیں ہیں؟ لیکن یہ مہمانوں کے سامنے کھولے نہیں جا سکتے تھے۔

پورے دو گھنٹے کے بعد مہمان ٹلے۔

دلیپ نے گھر کا صدر دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی اور نہ آ جائے۔ اور پھر اس نے دونوں تھیلے خالی کرے۔ نوٹوں کی گڈیوں کا ڈھیر فرش پر لگا یا۔ اس منظر کر دیکھنے کے لیے خاص طور پر پوشیا کو بلایا گیا تھا۔

"بابا..... دیکھا! اس ذرا سی زمین کے ٹکڑے کو فروخت کرنے سے اتنے سارے پیسے آئے ہیں۔"

ہی ہی ہی..... کر کے پوشیا ہنسنے لگا۔ اس نے نوٹوں کی گڈیوں کو چھوا بھی نہیں۔ "یہ سب تمہارے ہیں۔ میرے کس کام کے....." کہتے ہوئے وہ اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی بھی تاثر نہیں تھا۔ نہ ان نوٹوں کی گڈیوں کے ڈھیر کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرائی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک بیزاری تھی اور وہ بیزاری سے

نوٹوں کے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا۔

بچوں کے لیے نوٹوں کی گڈیوں کا وہ ڈھیر ایک کھیل ہو گیا تھا۔ وہ نوٹوں کی گڈیاں ہاتھ میں لیتے انھیں الٹ پلٹ کر دیکھتے اور کبھی کبھی ان کو گننے لگ جاتے۔ ماں باپ پیار سے اپنے بچوں کی ان حرکتوں کو دیکھ رہے تھین۔ ان کی طرح بچوں نے بھی کبھی اتنی نوٹیں نہیں دیکھی تھیں۔

پھر سو، پانچ سو اور ہزار کی نوٹوں کی گڈیوں کے ڈھیر الگ الگ لگا دیئے گئے۔

اور ہر کوئی ان کو گننے لگا۔ کسی کی گنتی میں فرق نہیں آتا تھا۔ ہر کوئی ان نوٹوں کو ۹۹/لاکھ ہی گنتا تھا۔ دلیپ کو یہ دیکھ کر اطمینان ہو رہا تھا کہ اس کے گھر والوں نے بھلے ہی ۹۹/لاکھ کبھی نہیں دیکھے تھے لیکن ان کی گنتی کافی اچھی ہے۔ وہ گنتی میں کمزور نہیں ہیں۔

پھر ان پیسوں کو رکھنے کا مسئلہ آیا۔

تو یہ طے کیا گیا کہ کلپنا کے کپڑوں کی الماری میں رکھ دیے جائیں۔ کلپنا کے جہیز کی کپ برڈ کافی مضبوط تھی اور اس میں تالا بھی تھا۔

اس الماری کے کپڑے خالی کر لیے گئے۔ الماری کو رکمنی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور سارے پیسے سلیقے سے اس میں رکھ دیے گئے۔ پوری الماری پیسوں سے بھر گئی۔

۱۰۰/ کی نوٹیں.....

۵۰۰/ کی نوٹوں کی گڈیاں..........

۱۰۰۰/ روپئے کی نوٹوں کی گڈیاں.........

الگ الگ خانوں میں سلیقے سے سجا دی گئی۔

تالہ لگا کر چابی رکمنی کو دے دی گئی۔

رکمنی نے کسی مالکن کی طرح وہ چابی اپنے کمر کے ساڑی کے نیفے میں ٹھونس دی اور سب کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔

اس چکر میں کسی نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

رات آئی اور ہر کسی کے لیے رات کاٹنی مشکل ہوگئی۔ رات کی طوالت بڑھتی جارہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی تھیں۔ باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا جو کہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا بلکہ جیسے اس رات کی کبھی صبح نہیں ہوگی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اس دن دلیپ نہ تو دودھ فروخت کرنے کے لیے شہر گیا اور نہ ایک اس نے بھینسوں کا دودھ دھویا۔ گھر میں ایک کروڑ روپیہ ہو اور ان میں سے ۲۵ / لاکھ روپیہ اس کے حصے میں آنے والے ہو تو بھلا دو چار سو روپیوں کے لیے کوئی اتنی محنت کیوں کرے گا۔

پوشیا اسے آوازیں دیتا رہا کہ دلیپ اٹھ دیر ہو رہی ہے۔ بھینسوں کا دودھ نکال، اسے لے کر شہر جا لیکن دلیپ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ جب دلیپ کے کانوں پر جوں نہ رینگی تو پوشیا اسے گندی گندی گالیاں دینے لگا۔

''حرامی، کتے کے پلّے ...... جانوروں کے تھنوں میں دودھ ہے۔ انھیں تکلیف ہو رہی ہے، جلدی دودھ نکال'' ..... لیکن دلیپ نے جیسے طے کر لیا تھا کہ وہ پوشیا کی باتوں پر دھیان نہیں دے گا۔ جب پوشیا نے دیکھا کہ دلیپ ٹس سے مس نہیں ہو رہا ہے اور تھنوں میں دودھ کی شدت سے بھینسوں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ وہ بار بار منہ سے آوازیں نکال رہی ہیں تو وہ خود ہی بھینسوں کا دودھ دھو لیا۔ دودھ سے دونوں کین بھر گئے تھے لیکن وہ وہیں پڑے رہے۔

نہ تو انھیں لے جانے کو کوئی تیار تھا اور نہ اس کا کیا استعمال کیا جائے اس سلسلے میں فیصلہ کرنے والا کوئی تھا۔ اس دن پوشیا کی دونوں بیٹیاں بھی آگئی تھیں۔ انھیں خبر مل گئی تھی کہ زمین بک گئی ہے اور اس کے پیسے گھر آگئے ہیں تو اپنا حصہ لینے کے لیے وہ میکے پہنچ گئی تھیں۔ انھیں علم ہو گیا تھا کہ انھیں ماں کے حصے سے پانچ پانچ لاکھ روپیہ ملنے والے ہیں۔ بھلا اتنی بڑی رقم کوئی چھوڑ سکتا ہے۔

وہ تو زمین فروخت ہونے کا انتظار کر رہی تھیں اور جیسے ہی انھیں خبر ملی وہ آدھمکیں۔

رکمنی نے الماری کھول کر انھیں نوٹیں بتائیں تو ان نوٹوں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں تم دونوں کو پانچ پانچ لاکھ روپیہ دینے والی ہوں، رکمنی انھیں وصیت کرنے لگی۔ یہ روپیہ لے جا کر اڑا نہیں دینا۔ انھیں سنبھال کر رکھنا۔ اپنے لیے اور اپنی بیٹیوں کے لیے دو چار لاکھ روپیوں کے زیور بنا لینا۔ آگے کام ہی آئیں گے۔ اچھی ساڑیاں اور کپڑے خریدنا اور تھوڑا بہت پیسہ گھر میں ہی خرچ کرنا۔

''چھوٹی تو دھیان سے سن۔ تیری تین بیٹیاں ہیں۔ ابھی سے ان کے لیے زیورات بنا لینا۔'' ''جی ماں جی!'' .... ماں کی بات سن کر اس نے جواب دیا۔

بیٹیوں نے تاویل پیش کی کہ آج ان کے گھر میں ایک اہم ضروری مذہبی رسم ہے جس میں ان کی شرکت بے حد ضروری ہے۔ اس لیے وہ شام کو ہی واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہیں تو رکمنی نے ان کے حصے کے پانچ لاکھ روپے انھیں دے دیے۔

پانچ لاکھ روپے پاتے ہی شام تک رکنے والی دونوں بیٹیاں فوراً اپنے سسرال کے لیے روانہ ہوگئیں۔ رکمنی نے کچھ سوچ کر تینوں بیٹوں کو بلایا۔

''دیکھو یہ سب پیسے تمہارے ہیں۔ میں کب تک انھیں سنبھالوں؟ اپنے اپنے حصے کے پیسے لے لو اور ان سے وہ کاروبار شروع کرو جس کے لیے زمین فروخت کی گئی ہے۔''

''جی ماں!'' ..... ماں کی بات سن کر تینوں نے جواب دیا۔

رکمنی نے الماری سے روپیہ نکال کے انھیں دینے شروع کر دیے۔

''دلیپ ..... یہ تمہارے حصے کے ۲۵ / لاکھ روپے .....''

دلیپ نے روپیہ ہاتھ میں لیا ان پر ایک نظر ڈالی۔ نظروں سے انھیں گنا اور اطمینان کر لیا کہ ماں نے اسے اس کے حصے میں سے کچھ کم پیسے تو نہیں دیے ہیں۔ پیسے پورے تھے۔

''سندر... یہ تیرے ۲۵ / لاکھ...'' کہتے رکمنی نے سندر کی طرف ۲۵ / لاکھ روپیہ بڑھا دیا۔

سندر نے وہ پیسہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''موہن... یہ تمہارے ۲۵ رلاکھ...'' کہتے ہوئے رکمنی نے روپیے موہن کی طرف دیے۔

ان کو پیسہ دینے کے بعد رکمنی نے کباٹ کو تالہ لگا دیا۔

تینوں ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈیاں اٹھائے اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھے اور انھوں نے نوٹوں کی گڈیاں اپنے کمرے کے فرش پر پھیلا دی۔ بچے اسکول گئے تھے۔ اس وقت گھر میں صرف ان کی بیویاں تھیں۔

''یہ ہمارے حصے کے ۲۵ر لاکھ روپیے''.... انھوں نے اپنی اپنی بیویوں سے کہا تو ان نوٹوں کو دیکھ کر انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔

''یہ تو بتاؤ ان پیسوں کا تم کیا کرو گے؟'' مالتی نے نوٹوں پر نظر ڈالتے ہوئے دلیپ سے پوچھا۔

''سب سے پہلے تو ان پیسوں سے تمہارے لیے چار پانچ لاکھ کے گہنے خریدوں گا۔'' دلیپ نے کہا تو مالتی شرما گئی۔

''اب تو تمہیں کبھی شکایت نہیں رہے گی کہ تمہارے پاس ٹھیک ڈھنگ کے کپڑے اور گہنے نہیں ہیں۔ تمہارے گلے میں آٹھ دس تولہ کا جب ہار لٹک رہا ہوگا تو ہر عورت تمہیں رشک سے دیکھے گی اور ایک دوسرے کی طرف اشارہ کر کے کہے گی یہ دلیپ پاٹل سیٹھ کی بیوی ہے۔''

جیسے جیسے دلیپ کہتا جا رہا تھا مالتی کے گالوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔

''یہ تو ٹھیک ہے باقی پیسوں کا کیا کرو گے یہ تو بتاؤ؟'' بات بدلتے ہوئے مالتی نے کہا۔

''یہ تو میں نے پہلے ہی طے کر لیا ہے اور بیس بھینس خریدوں گا اس طرح ۲۴ بھینسیں ہو جائیں گی۔ جگہ کافی ہے۔ طبیلہ ٹھیک ڈھنگ سے بنا لوں گا۔ اس طرح روزانہ ہزار دو ہزار روپیہ کی آمدنی ہو جائے گی۔ باقی زندگی آرام سے گذر جائے گی''.... دلیپ نے جواب دیا۔

''اس کے علاوہ؟'' مالتی نے دلیپ کی آنکھوں میں جھانکا.....

''مکان بہت پرانا ہو گیا ہے۔ جگہ جگہ سے گر رہا ہے۔ اسے توڑ کر ایک بنگلہ بنانا ہے''.....دلیپ نے جواب دیا۔

''لیکن اس میں ایک مسئلہ ہے۔ بنگلہ بنانے کے لیے میں ہی پیسے خرچ نہیں کر سکتا کیونکہ اس بنگلہ میں تو سبھی رہیں گے۔ اس لیے خرچ بھی برابری سے کرنا چاہیے۔ مگر میں سمجھتا ہوں اس کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ خرچ برابری کا کرنا ہے اور پھر ایک اجتماعی مکان میں زندگی بھر رہنے میں کوئی تک بھی نہیں ہے۔ اس لیے ممکن ہے موہن اور سندر کہے کہ ہم اپنا اپنا الگ بنگلہ بنا لیں گے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں بھی اپنا الگ بنگلہ بنالوں گا لیکن ایک شرط ہے ماں اور بابا میرے ساتھ رہیں گے۔''

''اس حالت میں ان کو کون چھوڑ سکتا ہے''.....مالتی بولی۔

''ٹھیک ہے وہ ہمارے ساتھ ہیں رہیں گے۔''

''میں رات میں ہی موہن اور سندر سے اس سلسلے میں گفتگو کرتا ہوں''..........دلیپ بولا۔

رات کے کھانے کے بعد پھر ایک بار پورا خاندان صلاح ومشورے کے لیے بیٹھ گیا۔ اس میں معمول کے مطابق پوشیا شریک نہیں تھا۔ وہ اپنی چارپائی پر بے خبر سو رہا تھا۔

''موہن میں پوچھنا چاہتا ہوں آخر تم ان پیسوں کا کیا کرو گے؟ ہم نے جس مقصد کے لیے زمین فروخت کی ہے وہ مقصد پورا ہونا چاہیے۔ ورنہ ان پیسوں کا ہم نے صحیح استعمال نہیں کیا اور رنگ رلیوں، عیاشیوں میں یہ پیسہ اڑا دیا تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے''.........دلیپ نے دونوں بھائیوں سے پوچھا۔

''دادا میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں اپنی کرانہ سامان کی ہول سیل دکان کھولوں گا۔

میں برسوں سے ایک کرانہ دکان پر کام کر رہا ہوں۔ اس لیے مجھے اسی دھندے کا اچھی طرح علم ہے اور اس کے تمام گروں سے واقف ہوں۔ اس کے علاوہ شہر کے تمام چھوٹے بڑے کرانہ دکان داروں سے واقف ہوں۔ وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان پیسوں سے پہلے شہر میں کوئی دکان کرایے پر لوں گا یا اگر مناسب دام میں کوئی دکان ملے تو خرید لوں گا اور بھرپور سامان بھر کر اپنا دھندہ شروع کروں گا۔ مجھے امید ہے مجھے اس دھندے میں اچھی کامیابی ملے گی کیونکہ میں اس دھندے کا تمام گر سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

''اچھی بات ہے''..... موہن کی بات سن کر دلیپ بولا..... ''ایسا ہے تو تم تاخیر کیے بنا اپنا کاروبار شروع کرنے کی تیاریوں میں لگ جاؤ کیونکہ جیسے جیسے وقت گذرتا جائے گا تمہارے پاس پیسے ختم ہوتے جائیں گے اور تم میں سستی اور کاہلی بھی آئے گی .... ہاں سندر تم بتاؤ، ان پیسوں سے تم کیا کاروبار شروع کرنا چاہتے ہو؟'' موہن کے بعد دلیپ نے سندر سے پوچھا۔

''دادا میں بھی اپنا کاروبار کافی پہلے طے کر چکا ہوں۔ میں ایک بلڈنگ میٹریل سپلائر کی دکان پر کام کرتا تھا۔ اس لیے مجھے اس کام میں اچھا تجربہ ہے کہ مال کہاں سے لایا جاتا ہے؟ کس قیمت میں خریدا جاتا ہے اور کس قیمت میں فروخت کیا جاتا ہے؟ اس دھندے میں کتنا منافع ہے ..... اس کے علاوہ میں شہر کے تمام بلڈروں سے واقف ہوں۔ جن کو اس طرح کے مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایک روپیہ کم میں مال دیا جائے اور ادھار کی سہولت دی جائے تو ہر بلڈر اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح میرا دھندا چل نکلے گا۔ اس کے لیے مجھے سب سے پہلے شہر میں کوئی دکان کرائے پر لینی پڑے گی یا خریدنی ہوگی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایک دو دن میں یہ کام ہو جائے گا...'' سندر نے بھی اپنا منصوبہ بتا دیا۔

''جہاں تک میرا تعلق ہے میں بھی اپنا دھندہ اب بڑے پیمانے پر کرنا چاہتا ہوں''..... دلیپ نے بھی اپنا منصوبہ بتانا شروع کیا.... ''میں بڑا طبیلہ ڈالنا چاہتا ہوں جس میں کم سے کم ۲۴

سے ۴۰ بھینسیں ہوں۔ جگہ کی تو ہمارے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ دو چار دن میں طبیلہ بڑا کرنے کا کام شروع کردوں گا۔ ایک بار طبیلہ تیار ہوگیا تو گجرات جا کر ۲۰، ۲۵ بھینسیں اور لے آؤں گا۔''

''بہت اچھی بات ہے''..... دلیپ کی بات سن کر دونوں بھائی بولے ..... ''تم برسوں سے اسی دھندے میں ہو اور اس دھندے کو مندی نہیں ہے۔ تمہارا کاروبار آج بھی چل رہا ہے کل بھی چلتا رہے گا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم جتنے بڑے پیمانے پر کاروبار کروگے اتنا کماؤ گے۔

اب سب سے اہم بات.........

''وہ کونسی بات ہے؟'' دونوں نے دلیپ کا چہرہ دیکھا۔

''ہمارا مکان کافی پرانا اور بوسیدہ ہوگیا ہے۔ ہمیں اسے توڑ کر ایک بنگلہ بنانا ہے۔''

''ہاں یہ تو بے حد ضروری ہے۔ آخر ہم کب تک اس کھپریل کے مکان میں رہیں گے۔ ہمارے پاس اتنے پیسے آگئے ہیں تو ہمیں اچھے مکان میں بھی رہنا چاہیے''.....دونوں بھائی بولے۔

''بنگلہ پورے خاندان کی ضروریات کے مطابق بنے گا اور اس میں پورے خاندان کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر انتظامات رکھے جائیں گے۔ یہ کافی خرچ والا کام ہے۔ جب ہم سب کو اس میں رہنا ہے تو اس بنگلہ کی تعمیر میں ہمارا خرچ بھی برابر ہوگا۔''

دلیپ کی بات سن کر سندر اور موہن خاموش ہوگئے۔

''کیا بات ہے؟ تم اس سلسلے میں جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟'' دلیپ نے انھیں ٹوکا۔

''دادا میرا خیال ہے میں شہر میں ہی کوئی فلیٹ خرید لوں یا کرائے پر لے کر رہنے لگوں کیونکہ آخر میرا کاروبار بھی تو شہر میں رہے گا۔ اپنے بچوں کو بھی شہر کی اسکول میں داخل کراؤں گا۔ جب مجھے یہاں رہنا نہیں ہے تو پھر بنگلہ کی تعمیر میں حصہ لے کر کیا فائدہ اور مان لو اگر مجھے یہاں

رہنا بھی پڑے تو میرا ارادہ ہے اپنا الگ بنگلہ بنانے کا تاکہ مستقبل میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے
''.... موہن نے صاف صاف جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں ...... تمہاری مرضی تم یہاں رہنا چاہتے ہو یہاں رہو۔ شہر میں رہنا چاہتے ہو شہر میں جا کر رہ سکتے ہو۔''.... موہن کی بات سن کر دلیپ اس سے بولا پھر وہ سندر کی طرف مڑا......

''سندر اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''دادا میرے اور موہن کے خیالات ایک جیسے ہیں۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ تم میرے ساتھ بنگلہ میں اجتماعی طور پر رہنا نہیں چاہتے؟'' دلیپ نے پوچھا۔

''نہیں...''

''کوئی بات نہیں۔ تمہاری مرضی لیکن میں یہاں اپنے لیے بنگلہ بناؤں گا اور طبیلہ بھی بڑا کروں گا کیونکہ مجھے یہاں ہی رہنا ہے اور یہاں ہی کاروبار کرنا ہے''.... دلیپ نے صاف کہہ دیا۔

''ہمیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم شوق سے یہاں بنگلہ بنا سکتے ہو''..... دونوں نے جواب دیا۔

''اس کے لیے مجھے پرانہ مکان توڑنا پڑے گا۔''

''تم بنگلہ بنانے کے لیے مکان بھی توڑ سکتے ہو''..... دونوں نے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے! میں کل سے ہی اس کام میں لگ جاؤں جاتا ہوں۔''

☆☆

○

دلیپ نے اپنے طبیلے کا کام شروع کر دیا تھا۔ ۲۵ بھینسوں کے طبیلے کے لیے کنٹراکٹر نے ۵/لاکھ روپیہ خرچ بتایا تھا۔ اس نے وہ کنٹریکٹ اسی کنٹراکٹر کو دے دیا تھا۔ جگہ کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ چاہتا تو ۴۰/بھینسوں یا ۵۰/بھینسوں کا بھی طبیلہ بنا سکتا تھا۔ لیکن فی الحال اس نے ۲۵/بھینسوں کا طبیلہ ہی بنانا مناسب سمجھا۔ اس کا کام کچھ اس طرح سے شروع کیا گیا تھا کہ اس سے لگ کر آگے اگر دوسرا یا زائد بھینسوں کے لیے طبیلہ کا کام شروع کرے بھی تو کوئی پریشانی نہ ہو۔

کام اس طرح شروع گیا تھا کہ اس کے پرانے طبیلے کو بھی نہیں چھیڑا گیا تھا۔ وہاں اس کی چار بھینسیں بدستور تھیں اور طبیلہ کا کام ختم ہونے تک وہ وہاں آرام سے رہ سکتی تھیں۔

طبیلہ بالکل جدید طرز کا بنایا جارہا تھا۔ جس میں جانوروں کو زیادہ سے زیادہ آرام ملے اور کام کرنے والوں کو بھی زیادہ تکلیف نہ ہو۔ وہ اس سلسلے میں دو تین بار ممبئی کے گوریگاؤں اور کامن کے چیچولی وغیرہ علاقوں کے طبیلے بھی دیکھ آیا تھا۔ وہ اپنے لیے انہی طرز کا طبیلہ بنانا چاہتا تھا۔

اب بھینسوں کا دودھ دھونے اور دودھ کو سائیکل پر لاد کر شہر ابراہیم بھائی کی دکان تک

پہنچانے جیسے چھوٹے کاموں میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔

اس نے اس کے لیے ایک نوکر رکھ لیا تھا۔ اس کی تنخواہ پانچ ہزار روپیہ ماہوار طے ہوئی تھی۔ اس کا کام بھینسوں کا دودھ دھونا اور شہر ابراہیم بھائی کی دکان تک پہنچانا اور شہر سے بھینسوں کی خوراک لانا تھا۔ اس نے کافی سوچ سمجھ کر نوکر رکھا تھا۔

آگے اسے اسی طرح کے کئی نوکروں کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ جب اس کا طبیلہ بڑا ہو جائے گا اور بھینسوں کی تعداد بھی بڑھ جائے گی تو وہ اس وقت اکیلا یہ سارے کام نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی سے کوئی ایماندار نوکر یہ کام کرے تو آگے وہ کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ چھیدی رام یوپی سے کام کی تلاش میں آیا تھا اور اسے اس کام کا اچھا تجربہ تھا۔ اس نے ایک کونے میں اسے رہنے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ جس سے چھیدی بہت خوش تھا اور اس کا بھی ایک بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اور اس کی ایک پریشانی بھی کم ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی سائیکل چھیدی کو دے دی۔

اس کی جگہ اس نے ایک نئی موٹر سائیکل خرید لی تھی۔ گھر میں ایک ساتھ تین نئی موٹر سائیکلیں آئی تھیں۔ موہن اور سندر نے بھی نئی موٹر سائیکل خرید لی تھیں کیونکہ اب انھیں سائیکل پر شہر آنا جانا شان کے خلاف محسوس ہوتا تھا۔

موہن تو جیپ یا کار بھی خریدنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے ابراہیم بھائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب اپنے دودھ کا حساب لینے کے آٹھ آٹھ دن میں آیا کرے گا۔ روزانہ دودھ کا حساب لینے آنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں ہے کیونکہ اس نے طبیلہ بنانے کا کام شروع کیا ہے۔ اس پر ابراہیم بھائی نے اسے مبارکباد دی تھی اور اس کے نئے طبیلے کا دودھ بھی خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔

ادھر گجرات میں بھینسوں کے دام آسمان پر پہنچ گئے تھے اس وجہ سے اس کا بجٹ گڑبڑا گیا تھا۔ اس کا ارادہ فوراً گجرات جا کر بھینسیں لانے کا تھا۔ مگر بڑھتے ہوئے داموں کو دیکھ کر وہ رک گیا

اور یہ طے کیا کہ جب طبیلہ مکمل ہو جائے گا اسی وقت جا کر بھینسیں لائے گا۔ طبیلہ مکمل ہونے میں دو ماہ تو لگ جائیں گے تب تک اسے امید تھی بھینسوں کے دام بھی کم ہو جائیں گے۔

چھیدی اور پوشیا میں خوب جمنے لگی تھی۔

کیونکہ دونوں کو ہی طبیلہ دیکھنا تھا۔

گھر کی عورتوں اور رکمنی نے کھیت میں کام پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ اب سارے کام مزدور سے کرائے جائیں۔

پوشیا بدستور کھیت پر جاتا تھا اور کھیت کے سارے کا کام کرتا تھا۔ ان دنوں کھیت میں اتنے زیادہ کام تو نہیں تھے۔ کام بڑھیں اور نئے مسائل پیدا ہوں اس ڈر سے اس نے سبزیاں لگانی بند کر دی تھیں ورنہ اس کے کھیتوں میں سال بھر سبزیاں اگتی رہتی تھیں اور ان کی دیکھ بھال پوشیا، رکمنی اور گھر کی عورتیں کرتیں تھیں لیکن اب عورتوں نے کھیت میں جانے سے ہی انکار کر دیا تو نئی سبزیاں لگا کر کیا فائدہ؟

پہلے وہ معمولی ساڑیوں اور کپڑے کاشٹے میں کھیت میں بنا جھجک کام کیا کرتیں تھیں لیکن اب ان کے تن پر قیمتی ساڑیاں آ گئی تھیں۔ ساڑیاں کپڑے خراب نہ ہوں گے اس خوف سے وہ کھیت میں نہیں جاتی تھیں۔

اس وعدہ کے مطابق مالتی کو پانچ لاکھ روپیہ کے اس کے پسند کے سونے کے زیورات دلائے تھے اور کم سے کم ۲۰؍ہزار کی نئی ساڑیاں دلائی تھیں۔ ان کی وجہ سے اب مالتی کی دنیا بدل گئی تھی۔ وہ دن میں دو تین بار ساڑیاں بدلتی اور دن بھر اپنے جسم پر سونے کے گہنے لادے رہتی۔ کبھی کبھی اسے مالتی کی اس تبدیلی پر ہنسی بھی آتی تھی۔ گھر میں گہنے جسم پر لادنے سے کیا حاصل۔ گھر کے ممبران کے علاوہ تو انھیں کوئی دیکھنے سے رہا لیکن مالتی کا کہنا تھا، گہنے ہیں تو نھیں گھر میں بھی پہننا چاہیے انھیں صرف موقع پر پہن کر کیا فائدہ؟ مواقعوں پر پہن کر انھیں تجوری میں بند کر کے

کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

مالتی کے زیور دیکھ کر کلپنا اور وسندھرا نے بھی سندر اور موہن سے گہنے اور کپڑے کی مانگ کی تھیں۔ وہ دونوں بھلا اس بارے میں کب اس سے پیچھے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنی بیویوں کو لاکھوں روپیوں کے سونے کے زیورات اور قیمتی کپڑے لا کر دیے تھے۔ وہ بھی دن میں تین تین ساڑیاں بدلتی اور دن بھر اپنے جسم پر زیورات لادے رہتی۔

رکمنی کب ان سے پیچھے ہٹنے والی تھی۔ اس کے پاس تو پورے ۱۵/ لاکھ روپئے تھے اور وہ اکیلی ان کی مالک و مختار تھی۔ وہ جس طرح چاہے انھیں خرچ کر سکتی تھی۔ ایک دن وہ بھی مالتی کے ساتھ جا کر اپنے لیے لاکھوں روپیوں کے زیورات اور ساڑیاں خرید لائی اور وہ بھی بہوؤں کی طرح رہنے لگی۔

اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں گھر کی عورتوں کے جسم پر لدے زیورات کو دیکھ کر ہر کوئی حیرت میں پڑ جاتا تھا۔ یہ اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہنے والے لوگ اتنے آسودہ ہے۔ ان انھیں اپنا وہ پرانا مکان ان کے رتبہ کے خلاف محسوس ہوتا تھا۔ دلیپ نے اسے توڑ کر بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے طبیلے کا کام تو جاری تھا۔ اس نے اس کے کانٹریکٹر اور ایک دو کنٹریکٹروں سے اس سلسلے میں بات چیت کی۔ ایک بہت بڑے آرکیٹکٹ سے گھر کا نقشہ بھی بنایا۔

جب اس گھر کے نقشے کے مطابق بنگلہ تعمیر کرنے کا بجٹ نکلا تو بجٹ سن کر اس کے پیروں تلے کی زمین کھسک گئی۔ کوئی بھی اس طرح کا بنگلہ ۲۰/ لاکھ روپیہ سے کم قیمت پر بنانے کو تیار نہیں تھا اور اس وقت اس کے پاس مشکل سے ۱۵/ لاکھ روپیہ تھے۔ ان میں سے بھینسوں کے لیے کم سے کم ۸ سے ۱۰ لاکھ روپیہ چاہیے۔

کام اور ڈیزائن کم ہوتے گئے۔ تعمیر میں کام آنے والے لوازمات کی مقدار اور کوالیٹی میں کمی کرنے کے بعد بڑی مشکل سے ۱۰ لاکھ روپیہ میں ایک کنٹریکٹر تیار ہوا۔ لیکن کام فوراً شروع

کرنا ممکن نہیں تھا۔ رہنے کا مسئلہ تھا۔

موہن اور سندر نے کہہ دیا ہم شہر میں کوئی فلیٹ کرائے پر لیتے ہیں اور رہنے کے لیے وہاں شفٹ ہو جاتے ہیں۔ اب اس کا مسئلہ تھا۔ تو اس نے یہ طے کیا کہ زیر تعمیر طبیلے کے ایک کونے میں عارضی طور پر ایک دو کمرے بنائے جائیں اور جب تک بنگلہ تعمیر نہیں ہو جاتا وہ لوگ اس میں رہیں گے۔ آخر اتنا سمجھوتہ تو کرنا ہی پڑے گا اور اس سمجھوتہ کے لیے سب تیار تھے۔

عارضی طور پر طبیلہ کے آخری حصہ میں دو کمرے بنائے گئے اور گھر کا سارا سامان اس میں منتقل کر دیا گیا۔ موہن اور سندر نے شہر میں کرائے سے ایک ایک فلیٹ لے لیا اور وہ اپنے مال و اسباب، ساز و سامان کے ساتھ ان نئے کرائے کے مکانوں میں منتقل ہو گئے۔ کنٹریکٹر کو کانٹریکٹ دے دیا گیا۔ اسے پیشگی طور پر ایک خطیر رقم دے دی گئی تاکہ وہ کام جلد اور تیزی سے شروع کر سکے۔

رقم ملتے ہی اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ پرانا مکان ڈھا دیا گیا۔ اس دن پوشیا بہت غصے میں تھا۔ اس دن س نے کچھ زیادہ ہی شراب پی لی تھی اور وہ گھر کے سامنے آنگن میں رکھے پتھر پر بیٹھ کر ٹوٹے ہوئے مکان کو دیکھ کر مسلسل بچوں کو گالیاں دیے جا رہا تھا۔

''حرامی ... کتے کمینے .... میرے پیٹ سے سور کے بچے جنمے ہیں۔ انھوں نے میرے آباواجداد کا برسوں پرانا مکان توڑ دیا۔ یہ مکان میرے باپ دادا کی نشانی تھی۔ انھوں نے کتنی محنت و مشقت سے اسے بنایا تھا۔ ایک میں ہی جو اس میں اتنے سالوں سے شان سے رہ رہا تھا۔ یہ سارے حرامی .... کتے .... سور ..... اسی مکان میں جنمے تھے اور انہی نے مل کر میرے آباو اجداد کا مکان توڑ ڈالا۔ انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ اس مکان میں پلے بڑے ہیں۔ اپنے آباواجداد کی نشانیوں کی انھیں کوئی قدر نہیں ہے۔ ان کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہے۔ بابا مجھے معاف کر دو، میں شرمندہ ہوں، میں تمہارا مجرم ہوں، میں نے تمہارا بنایا ہوا مکان توڑ ڈالا۔ اس

مکان میں میں زندگی بھر رہا۔ میں تمہارے اس مکان میں ایک اینٹ بھی نہیں لگا سکا اور آج تمہاری نشانی، تمہارے اس مکان کو حرامیوں نے توڑ ڈالا۔ اسے توڑ کر بنگلہ بنا رہے ہیں، بنگلہ میں رہیں گے۔ بھکاری لوگوں کو جھونپڑے میں رہنے کا سلیقہ اور اوقات نہیں ہے بنگلہ میں رہنے جا رہے ہیں۔''

اچھا ہوا پوشیا نے اپنی ان گالیوں کا کاریکرم شام میں شراب پینے کے بعد شروع کیا تھا۔ جب مکان توڑا جا رہا تھا اس وقت وہ کچھ نہیں بولا تھا صرف خونی آنکھوں سے اپنے مکان کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب مکان پوری طرح توڑ دیا گیا تو اس کی آنکھوں سے ویرانی چھلکنے لگی تھی۔ اگر وہ اس وقت اپنی گالیوں کا کاریکرم شروع کر دیتا تو کام کرنے والے مکان کو توڑنے کا کام بند کر کے بھاگ جاتے۔

شراب پیٹ میں جانے کے بعد ہی پوشیا کے منہ سے گالیاں نکلنی شروع ہوتی تھی۔ ورنہ وہ عام طور پر دن میں مشکل سے گالیاں دیتا تھا اور شراب پینے کے بھی اس کے اپنے اصول تھے۔ وہ صرف اور صرف شام کو شراب پیتا تھا اور وہ بھی صرف دیسی اور ایک محدود مقدار میں۔ دن میں کوئی اس کے سامنے دس بوتلیں لا کر رکھ دے تو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ نہ اسے کوئی دن میں زبردستی پلا سکتا تھا۔ نہ کبھی وہ مقدار سے زیادہ پیتا تھا۔ اس کی پہلی پسند دیسی شراب تھی۔ اگر دیسی شراب نہ ہو تو پھر بدیسی شراب کو ہاتھ لگاتا تھا۔ وہ دن بھر اپنے جذبات اور احساسات پر قابو رکھتا تھا۔ اس کو کوئی بھی بڑی چوٹ پہنچائے اس پر کتنے بھی بڑے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے وہ چپ چاپ اسے برداشت کر لیتا تھا۔ زبان سے نہ تو کبھی اُف کرتا اور نہ کوئی شکایت کا لفظ نکالتا۔

لیکن شراب پیٹ میں جاتے ہی جیسے اس کے ضبط کا بند ٹوٹ جاتا تھا اور وہ اپنے سارے جذبات اور احساسات، دل کی باتیں گالیوں کے موتی میں پرو کے لوگوں کو تحفہ کے طور پر

بانٹنا شروع کر دیتا تھا۔ اس نے صرف ایک دن ہنگامہ کیا دوسرے دن بالکل نارمل تھا۔

دوسرے دن دن بھر مزدور ٹوٹے ہوئے مکان کا ملبہ اٹھاتے رہے اور جگہ کو مسطح کرتے رہے۔ وہ چپ چاپ تماشائی کی طرح انھیں دیکھتا رہا۔ شراب پی کر بھی آیا تو اس نے اس دن ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔

اس کے سارے گھر والے اس کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے۔ جب وہ گالیاں دیتا تو کوئی بھی اسے نہ کچھ سمجھاتا نہ اسے روکنے کی کوشش کرتا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ گالیاں بک بک کر وہ خود ہی تھک جاتا تھا اور نارمل ہو جاتا تھا۔

اسے سمجھانے کی کوشش کرنا یا اسے گالیاں بکنے سے روکنا ایک مصیبت کو گلے لگانا ہوتا تھا۔ ایسا کرنے پر وہ اس رفتار سے گالیاں دینے لگتا کہ پھر اس کے پاس کوئی بھی نہیں ٹھہر پاتا۔ اور کبھی کبھی وغصہ میں آکر اس کے ہاتھ میں جو چیز ہوتی اس سے مدمقابل یا سمجھانے واے یا اسے روکنے والے کو وہ مارنے لگتا تھا۔ اس لیے اسے کوئی بھی سمجھانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

موہن اور سندر نے فلیٹ کرائے پر لینے کر بعد ایک ایک دکان بھی کرائے پر لے لی تھی۔ بلاشبہ ان دکانوں کا کرایہ بھی بہت زیادہ تھا اور ڈپازٹ بھی بہت زیادہ تھا لیکن دکان شروع کرنے کے لیے یہ قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔ پہلے تو انھوں نے کوشش کی کہ دکان وہ خرید لیں۔ لیکن شہر ہی کیا پورے ملک میں پراپرٹی کے دام آسمان پر تھے۔

چھوٹے سے چھوٹے دکان کے گالے کی قیمت اتنی لگائی جاتی تھی کہ اگر دونوں بھائی مل کر بھی وہ گالہ خریدنے کی کوشش کرتے تو نہیں خرید پاتے۔ اس طرح انھوں نے فلیٹ بھی خریدنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک چھوٹے سے فلیٹ کی بھی اتنی قیمت لگائی جاتی کہ انھیں لگتا اتنی قیمت میں وہ یہ فلیٹ لے کر کیا کریں گے۔ اتنی قیمت پر تو وہ اپنے کھیت میں بڑا سا بنگلہ بنا کر شان سے رہ سکتے ہیں۔

اس لیے انھوں نے فلیٹ خرید نے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا تھا اور دونوں نے طے کیا تھا کہ وہ اپنے کھیت میں دلیپ کی طرح بنگلہ بنا کر رہیں گے۔ انھوں نے اپنی اپنی دکانیں بھی شروع کر دی تھیں۔ دونوں پر ان کو اتنا اچھا رسپانس تو نہیں تھا لیکن ان کو علم تھا.........

ان کا دھندہ فوراً شروع نہیں ہو جائے گا۔ دھیرے دھیرے ان کا دھندہ بڑھے گا جب لوگوں کو ان کی دکانوں کی خبر ہوگی۔ ویسے بھی دکانیں شروع کرنے کے بعد اپنے واقف کاروں سے مسلسل رابطہ قائم کر کے اپنی دکان کے بارے میں بتا رہے تھے اور ان سے درخواست کر رہے تھے کہ وہ ان کی دکان سے مال خرید کے انھیں شکریہ کا موقع دیں۔

لیکن پھر بھی ان کے کاروبار میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو پا رہا تھا..........

شہر میں رہتے ہوئے ان کے گھر والوں کو اتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا انھوں نے صاف کہہ دیا تھا اس سے بہتر تو وہ اپنے کھیت میں تھے۔

یہاں رہنے سے بہتر وہ اپنے کھیت میں بنگلہ بنا کر رہیں گے۔

☆☆

○

دلیپ کے بنگلے کے بازو میں ہی موہن اور سندر کے بنگلوں کا بھی کام شروع ہو گیا تھا۔
اس طرح ایک قطار میں تینوں بھائیوں کے بنگلے بن رہے تھے۔ ان بنگلوں کے پیچھے دلیپ کا طبلیہ تیار ہو گیا تھا لیکن اس میں صرف ۴ ہی بھینسیں تھیں۔

موہن اور سندر نے شہر میں فلیٹوں کی قیمتوں کو دیکھتے ہوئے شہر میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور اپنے کھیت میں بنگلہ بنانے کا طے کیا تھا۔ اسی کانٹریکٹر سے بات کی گئی جو دلیپ کا بنگلہ بنا رہا تھا۔ ساری شرائط پلان سب تے تھا۔ قیمت بھی طے تھی۔ اس لیے اسے ہی کام دے دیا گیا۔

اس کے لیے تو لاٹری لگ گئی تھی۔ ایک ساتھ اسے تین بنگلوں کا کام ملا تھا۔ اس میں اسے اچھا خاصا منافع ملنے والا تھا۔ دلیپ بھینس لانے گجرات گیا تھا۔ دلیپ کا بجٹ گڑ بڑ ہو گیا تھا۔ ابھی اسے بنگلہ بنانے والے کانٹریکٹر کے ۵ لاکھ روپے دینے تھے۔ اگر وہ کانٹریکٹر کے پیسے دے دیتا تو بھنس نہیں لا پاتا۔ اب وہ بھینسیں لا رہا تھا تو اس کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ وہ کانٹریکٹر کا پیسہ کس طرح ادا کرے گا۔

اچھی بات یہ تھی کہ تینوں بنگلوں رقوم کی ادائیگی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا بنگلہ تقریباً

تیار ہو گیا تھا۔ اس طرح اسے کانٹریکٹر کو پوری رقم ادا کر دینی ضروری تھی لیکن کیونکہ وہ موہن اور سندر کے بنگلوں کے کام کی بھی اچھی خاصی رقم ادا کر چکا تھا۔ اس لیے اسے اپنی رقم کی ادائیگی کی کوئی فکر نہیں تھی۔

آخر میں جب حساب ہوگا اس وقت اسے اپنے حصے کی رقم کانٹریکٹر کو ادا کرنی ہوگی۔ اسی وجہ سے اس نے ۲۰؍ بھینسیں لانے کا جوا کھیلا تھا۔ بھینسیں آجانے کے بعد اس کی آمدنی شروع ہو جاتی۔ اس طرح تمام بنگلوں کے کام کے خاتمے تک اس کے پاس کچھ رقم بھی جمع ہو جاتی۔ جسے وہ ٹھیکہ دار کو ادا کر سکے۔

موہن نے اپنی دکان میں بہت بڑی مقدار میں کرانہ کا مال بھرا تھا لیکن اسے اس کے باوجود اپنے دھندے میں کامیابی نہیں مل پا رہی تھی کیونکہ کرانہ سامان کے دام روزانہ چڑھتے اترتے ہیں۔ موہن کے بڑے پیمانے پر مال خریدنے کے بعد اچانک دام تیزی سے نیچے آگئے تھے۔ موہن نقصان سے سامان نہیں بیچ سکتا تھا۔ اس وجہ سے گاہک موہن کی دکان کا رخ نہیں کرتے تھے۔ جب وہی سامان ان کو دوسری دکانوں میں سستے داموں میں مل رہا تھا تو بھلا وہ موہن سے زیادہ داموں میں سامان کیوں خریدتے۔

سندر کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

بلڈنگ میٹریل سپلائی کے مال کا معاملہ ادھار پر منحصر ہوتا ہے۔ بلڈر ادھار مال لے کر اپنی عمارت بناتے ہیں اور جب انھیں بکنگ کے پیسے آتے ہیں یا پھر کوئی فلیٹ فروخت ہوتا ہے تو اس میں سے وہ بلڈنگ میٹریل سپلائر کی ادھاری ادا کرتے ہیں۔ سامان اتنا مہنگا ہوتا ہے کہ چالیس پچاس [illegible] مال یوں فروخت ہو جاتا ہے لیکن اس پر منافع کافی کم ملتا ہے اور کبھی کبھی تو چھ چھ ماہ میں بھی پیسے نہیں ملتے ہیں۔ سندر نے جب نئی دکان کھولی تو بھوکے گدھوں کی طرح بلڈر اس کی دکان پر ٹوٹ پڑے۔ سندر ان سبھوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ جس دکان پر وہ گذشتہ ۱۲؍ سالوں

سے کام کرتا تھا وہ اس دکان سے مال لیتے تھے۔ وہ بھی سندر کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے اس نے جب انھیں صرف اشارہ کیا تھا کہ وہ خود اپنی دکان کھولنے والا ہے تو انھوں نے اس کی دکان سے مال خریدنے کی حامی بھر لی تھی اور دکان شروع ہونے کے بعد مال خریدا بھی تھا۔ سندر نے دس لاکھ کا مال دکان میں بھرا تھا جو صرف آٹھ دنوں میں بک گیا لیکن قیمت کے نام پر اسے صرف دو لاکھ ہی مل سکے۔ ان دو لاکھوں سے اس نے پھر نیا مال خریدا جو دو دن میں بک گیا لیکن Payment کے نام پر اسے ایک پیسہ بھی نہیں ملا تھا۔

دس لاکھ کا مال بک گیا تھا لیکن اس کے ہاتھ ایک پیسہ بھی نہیں آیا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں سے مال خریدے اور کس طرح دکان چلائے۔ جن لوگوں نے مال خریدا تھا انھوں نے دو چار مہینوں بعد پیسہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ بلڈنگ میٹریل سپلائی کے دھندے کا یہ اصول ہوتا ہے کہ بلڈر اگر پرانے قرض کی ادائیگی کرتے ہیں تو نیا مال ادھار لیتے ہیں۔ ایک دو ماہ بعد ادھاری کے پیسے ملنے لگے تو انھیں دوبارہ دینے کے لیے اس کے پاس مال بھی نہیں تھا۔ ایک دو سے پیسہ لے کر انہی پیسوں کا مال خرید کر اس نے انھیں دوبارہ مال دے دیا۔

لیکن وہ ایک ایسے گورکھ دھندے میں پھنس گیا تھا جس سے وہ اب لاکھ نکلنا چاہے بھی تو نہیں نکل پا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دھندہ وہی آدمی کرسکتا ہے جس کے پاس کم سے کم پچاس ساٹھ لاکھ روپیہ نقد ہو۔ وہ پچاس ساٹھ لاکھ روپیہ ادھار بانٹ کر اسے وصول کرنے کی طاقت رکھتا ہو کیونکہ عام طور پر بلڈر لوگ غنڈے، بدمعاش اور بددیانت قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کو ادھار مال دینا تو بہت آسان ہے لیکن ان سے پیسہ وصول کرنا سچ مچ بہت مشکل کام ہے۔

اسے اس دھندے کو شروع کرنے پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر بھی غصہ آرہا تھا کہ وہ اتنے دنوں سے اس دھندے میں رہا لیکن اسی دھندے کی بنیادی باتوں کو بھی نہیں سمجھ سکا۔

وہ دھیرو بھائی کی دکان پر کام کرتا تھا اور دھیرو بھائی شہر کا مانا ہوا ''بھائی'' تھا۔ کروڑوں میں کھیلتا تھا۔ یہ ہر ہفتہ بلڈروں کو کروڑوں کا مال سپلائی کرتا تھا اور بلڈروں سے پیسہ وصول کرنے کی طاقت بھی رکھتا تھا۔ کسی بھی بدمعاش سے بدمعاش بلڈر میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ دھیرو بھائی کی ادھاری نہ دینے کی بات یا ہمت کر سکے۔

اس بارے میں وہ جب سوچتا تو اس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی۔ وہ رات رات بھر سو نہیں پاتا تھا یہ سوچ کر کے اس سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی ہے اور اس نے کتنے غلط دھندے کا انتخاب کیا ہے۔ دس لاکھ سے زائد روپیہ اس کا لوگوں کے پاس پھنسا تھا۔ روزانہ اس کا ایک ہی کام ہوتا تھا۔ ان بلڈروں کے آفس میں چکر لگانا۔ کبھی وہ ملتے تھے تو کبھی ہو کر بھی نہیں ملتے اور کہلا بھیجتے کہ نہیں ہے۔ ملتے تو ایک دو دن میں پیسہ دینے کا وعدہ کرتے لیکن وہ دن کبھی نہیں آتا جب اسے اپنا پیسہ ملتا۔

بعد میں اسے پتہ چلا کہ ان لوگوں کو دھیرو بھائی کی بھی شہ حاصل ہے۔ دھیرو بھائی نے ان سے کہا تھا.........

''سندر میرا نوکر تھا۔ اس نے بنا مجھ سے کہے میرا دھندہ شروع کیا ہے۔ میں اسے سبق سکھانا چاہتا ہوں۔ تم لوگ اس کی دکان سے مال لو مگر خبردار اسے پیسہ نہیں دینا جب تک میں نہ کہوں بالکل نہ دینا۔ وہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں پائے گا۔ اگر معاملہ بگڑے تو میرا نام لے لینا۔ معاملہ اگر بڑھے گا تو میں اسے نپٹ لوں گا۔ سندر میرا نوکر تھا۔ وہ دھندے میں میری برابری نہیں کر سکتا۔ میں اس کو دوبارہ نوکر بنا کر ہی دم لوں گا۔''

جیسے جیسے اسے یہ ساری باتیں معلوم ہوتی تھیں اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک سنہرے مستقبل کے لیے باپ پر زور ڈال کر زمین فروخت کروائی تھی۔ اسے ایک اچھی خاصی رقم بھی ملی تھی لیکن آج وہ اسی مقام پر تھا جہاں پہلے تھا۔

ایک معمولی آدمی سندر............

وہ سندر سیٹھ نہیں بن سکا تھا۔

اس کے پاس ایک کوڑی نہیں تھی۔

پانچ چھ لاکھ بیوی کے زیوروں اور گھر والوں کی عیاشیوں میں خرچ ہو گئے تھے۔ باقی دکان اور فلیٹ کے ڈپازٹ میں چلے گئے تھے۔ چھ لاکھ کے قریب وہ اپنا بنگلہ بنانے کے لیے ٹھیکہ دار کو ادا کر چکا تھا۔ بنگلہ تیار ہونے پر اسے چار لاکھ ٹھیکہ دار کو ادا کرنے تھے۔ دس بارہ لاکھ روپیہ لوگوں کی طرف ادھاری تھی جن کے ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

اب وہ ٹھیکہ دار کو بقایا رقم کس طرح ادا کرے گا؟ اگر ٹھیکہ دار کو اس کا بقایا ادا نہیں کیا تو وہ کام ادھورا چھوڑ دے گا۔ وہ تینوں بھائیوں میں دلیپ کو ایک کامیاب انسان مان رہا تھا۔ دلیپ نے جو کام بھی کیا ہوش میں کیا۔ اس نے جو دھندہ چنا اس دھندے میں وہ کسی کا محتاج نہیں تھا۔ تھوڑی سی محنت تھی لیکن اچھی خاصی آمدنی تھی۔ کچھ دنوں میں دلیپ کی بھینسیں آجائیں گی تو اس کی روزانہ کی ہزاروں کی آمدنی شروع ہو جائے گی۔ موہن کا حال بھی اسے معلوم تھا۔

موہن نے اس پرانے مال سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے کم داموں میں فروخت کر دیا۔ جس میں اسے کم سے کم تین لاکھ روپیہ نقصان ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے چھوٹے پیانے پر دھندہ شروع کر دیا تھا۔ دھندہ چل رہا تھا لیکن اس میں اسے مناسب نفع نہیں مل پا رہا تھا۔ اسکے علاوہ دکان میں دو نوکر تھے۔ اسے ہر ماہ دکان اور فلیٹ کا کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ شہر کے خرچ۔ اس کی آمدنی اتنی نہیں تھی جو وہ یہ سارے اخراجات اٹھا پاتا۔ سارے اخراجات اس کے جمع سرمائے میں سے ادا ہو رہے تھے اور اس کا اصلی سرمایہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔

اسے شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ کم سے کم اسے اتنی جلدی مکان بنگلہ بنانے کی جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ کام وہ سو سال کے بعد بھی کر سکتا تھا جب اس کا دھندہ اچھی

طرح چلنے لگتا۔

اسے ٹھیکہ دار کو دس لاکھ روپیہ دینے تھے۔ وہ چھ لاکھ روپیے ادا کر چکا تھا... چار لاکھ اور دینے تھے۔ اس کے پاس چار لاکھ روپیہ تھا۔ اگر وہ چاہے تو اسی وقت چار لاکھ روپیہ ٹھیکہ دار کو ادا کر سکتا تھا لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ اس کے بعد اس کے پاس اپنے دھندے کو بڑھانے کے لیے زائد پیسے نہیں رہیں گے۔ دلیپ گجرات سے واپس آ گیا تھا۔

اس نے ۲۰؍اعلیٰ قسم کی بھینسیں لائی تھی۔ اس کی قیمت اسے کچھ زیادہ ادا کرنی پڑی تھی لیکن اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ یہ بھینس جتنا زیادہ دودھ دینے والی ہے اس کے حساب سے ایک ماہ کے اندر اندر ان کی زائد ادا کی گئی رقم وصول ہو جائے گی۔

نئے بھینس اس کے نئے طبیلے میں باندھ دی گئی تھی۔ طبیلے کی دیکھ بھال کے لیے اس نے اور چار نوکر رکھ لیے تھے۔ پہلے سے چھیدی اور پوشیا تو موجود تھے ہی لیکن وہ اتنی زیادہ بھینسوں کو سنبھال نہیں سکتے تھے۔ اس نے دوبارہ بھینسوں کا دودھ نکالنے کا انتظام کیا تھا۔ اس کا اندازہ تھا دوبار میں اس کی بھینس ۲۰۰ سے ۲۵۰ لیٹر دودھ دیں گی۔

دودھ ابراہیم بھائی کی دکان تک پہنچانے کے لیے اس نے ایک ٹیمپو بھی خرید لیا تھا۔ اب اس کے ذمہ اس ٹیمپو کو چلانے کی ڈیوٹی آ گئی تھی۔ نوکر بھینسوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان کا دودھ دھوتے اور دودھ کے بڑے بڑے کین لا کر ٹیمپو میں لاد دیتے تھے۔ وہ ٹیمپو کے کر شہر جاتا۔ ابراہیم بھائی کو دودھ فروخت کرتا۔

پھر دودھ کا حساب لے کر جانوروں کے خوراک لے کر ۱۲؍بجے تک واپس گھر آتا تھا۔ تین چار بجے دوسرا دودھ نکل جاتا تھا۔ اسے پھر وہ دودھ لے کر جانا پڑتا تھا۔ وہ دودھ دے کر اور دودھ کا حساب کر کے وہ رات نو بجے تک ہی گھر واپس آ پاتا تھا۔

اس میں اسے اچھی خاصی آمدنی ہو رہی تھی۔ اس طرح اس کا بزنس اچھی طرح چل رہا

تھا۔

اس کا بنگلہ بھی تیار ہو گیا تھا۔ دلیپ نے گھر بھرنی کا ایک شاندار گروگرام رکھا۔ اس میں اس نے پانچ سو افراد کی دعوت کی گئی۔

بکرے کا مٹن قورمہ بنایا گیا اور شراب کا بھی انتظام کیا گیا۔ تمام رشتے دار تو اس پروگرام میں شریک ہی تھے۔ شہر کے سرکردہ افراد، تعلقات رکھنے والوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ دلیپ کی خوش قسمتی تھی یا پھر ان کے دلیپ کے اچھے مراسم جس کسی کو دعوت دی گئی تھی وہ اس دعوت میں شریک ہوا۔

لوگ تحفہ تحائف لے کر آئے۔

اس دن دلیپ نے خاص طور پر سفید سفاری پہنا تھا۔ مالتی نے ایک ریشمی قیمتی پیٹھنی ساڑی پہن رکھی تھی اور وہ زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ سندر اور موہن کی بیویاں بھی قیمتی ساڑیوں میں ملبوس زیورات سے لدی آنے والوں کا استقبال کر رہی تھیں۔ سندر موہن بھی پروگرام میں پیش پیش تھے۔ جو بھی ان سے ملتا اتنا اچھا بنگلہ بنانے پر دلیپ کو مبارکباد دیتا اور ان سے ان کے بنگلے کے بارے میں پوچھتا۔

تو وہ ان کے بارے میں بتانے لگتے کہ شاید دو مہینوں میں ان کے بنگلے بھی تیار ہو جائیں۔ جو بھی آتا دلیپ اور اس کے خاندان کے متعلق دل میں اچھا تاثر لے کر جاتا تھا۔

وہ دلیپ اور اس کے خاندان والوں کو معمولی لوگ سمجھتے تھے لیکن آج کے پروگرام میں ان کی آسودگی اور مالی حیثیت اور رتبے کی دھاک لوگوں کے دلوں میں بٹھا دی تھی۔

اس دن پروگرام میں پوشیا بھی شریک تھا۔ اس دن اس پر قسم ڈالی گئی تھی کہ وہ پروگرام کے خاتمے تک شراب نہیں پیئے گا۔ اسے قیمتی کپڑے پہنائے گئے تھے اور ایک صوفے پر بیٹھا دیا گیا تھا۔ ہر آنے والا اس سے ملتا تھا۔ اتنا اچھا بنگلہ بنانے پر اسے مبارکباد دیتا تھا۔

پوشیا منہ سے کچھ نہیں بولتا تھا صرف مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ایک کمرے میں چل رہے شراب کے دور کا اسے علم تھا اور شراب کی مانوس بد بو اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔

لیکن آج وہ اس سے محروم تھا۔

اس پر قسم جو ڈالی گئی تھی کیونکہ ہر کوئی جانتا تھا پوشیا جو اس وقت اتنی شرافت سے بیٹھا ہے اور ہر کسی سے مسکرا کر مل رہا ہے۔ ایک بار شراب اس کے پیٹ میں گئی تو شرافت کا چولہ اتر جائے گا اور اس کے اندر کا اصلی پوشیا جاگنے لگے گا اور بات بے بات پر دلیپ، گھر والوں کو گالیاں دینے لگے گا اور اتنے بڑے پروگرام میں ان کی عزت مٹی پلید ہو جائے گی۔ اس لیے دلیپ، موہن اور سندر باری باری پوشیا کو چیک بھی کرتے رہتے تھے۔

کہیں اس نے سب کی نظریں بچا کر شراب تو نہیں پی لی کیونکہ اگر ایسا ہوا تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

لیکن ان کے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ پوشیا نے ابھی تک ایک قطرہ بھی نہیں چکھی تھی۔

آٹھ دن قبل پوشیا نے بنگلہ کا نام رکھنے پر بڑا ہنگامہ کیا تھا۔ اس دن دلیپ نے بڑے پیار سے پوشیا کو اپنے پاس بلا کر کہا تھا........ ''بابا! میں اپنے بنگلے کا نام آپ کے نام پر رکھنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟'' اس کی بات سن کر پوشیا نے غرا کر پوچھا تھا....

''میرے پاس جو کچھ ہے سب آپ کا ہی دیا ہوا تو ہے۔ آپ نے مجھے پالا پوسا، اتنا بڑا کیا، اس قابل بنایا۔ یہ سب تو آپ کی محنت اور دعاؤں کا تو ثمر ہے۔ اس بنگلہ کی ایک ایک اینٹ میں جو پیسہ لگا ہے وہ سب آپ ہی کا تو ہے۔ ہم دس جنم لے کر بھی آپ کے احسانوں کا بدلہ ادا نہیں

کر سکتے۔ آپ کے لیے ہمارے دلوں میں جو عزت اور عقیدت ہے اس کے اظہار کے لیے میں اس بنگلہ کا نام آپ کے نام پر ''پوشیا کنج'' رکھنا چاہتا ہوں۔''

''تو نے یہ بنگلہ بنایا..... کس طرح بنایا..... یہ تو اچھی طرح جانتا ہے۔ میرے آباواجداد پرکھوں کے ارمانوں کا خون کر کے تو نے یہ بنگلہ بنایا ہے۔ تو نے مجھے ان کی روحوں کے سامنے شرمندہ کیا ہے۔'' پوشیا بھڑک اٹھا۔

پوشیا کے اس نئے تیور پر دلیپ ہکا بکا رہ گیا۔

''میں نے کیا کیا بابا..............؟''

''اب معصوم بن کر پوچھتا ہے میں نے کیا کیا؟ ارے تو نے ایک ایسا گھناؤنا جرم کیا ہے جس کے لیے میں تو کیا میرے آباواجداد کی روحیں تجھے کبھی معاف نہیں کر سکتیں۔''

''مجھ سے ایسا کون سا گناہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے نہ تو آپ مجھے معاف کر سکتے ہیں نہ آپ کے میرے آباواجداد کی روحیں......'' دلیپ نے حیرانی سے پوچھا۔

''اب اتنا بھولا مت بن حرامی...... کتے کے پلّے .....سوّر''

پوشیا کے منہ سے گالیوں کا طوفان ابل پڑا.... ''سارے گناہ کر کے بھولا بن رہا ہے اور معصوم بن کر مجھ سے پوچھ رہا ہے میں نے کیا گناہ کیا؟.... ارے تیرے گناہوں کو میں تو کیا بھگوان بھی معاف نہیں کرے گا۔ تو نے مجھے میرے آباواجداد کی خون پسینے سے خریدی زمین فروخت کرنے کے لیے مجبور کیا۔ یہ تیرا گناہ کم ہے؟ جھوٹا ہے تو...... میرے آباواجداد کا مکان جو ان کی یادگار تھی اس کو توڑ کر اس پر یہ عالیشان بنگلہ بنایا۔ کیا یہ تیرا گناہ چھوٹا ہے؟ اب مجھ سے کہہ رہا ہے تیرے اس گناہ کو میرا نام دیا جائے۔ خبردار... اگر بنگلہ کے ساتھ میرا نام جوڑا گیا تو۔ میں تجھے کاٹ ڈالوں گا۔ اس بنگلے کو بم سے تباہ و برباد اور تہس نہس کر دوں گا''..... کہتا وہ تیزی سے گھر سے باہر چلا گیا۔

دلیپ نے پوشیا کی باتیں سن کر اپنا سر پکڑ لیا۔ اس وقت وہاں رکمنی اور موہن بھی تھے۔

''دادا.... تم بابا کی باتیں دل پر مت لیا کرو'' سندر نے دلیپ کو سمجھایا..... ''ان کو تو اسی طرح باتیں کرنے کی عادت ہے۔''

''بابا نے ہمارے لیے جو کچھ کیا ہے اس سے بڑھ کر ہماری ماں نے بھی تو ہمارے لیے کیا ہے۔ اس نے ہمیں جنم دیا۔ یہ دنیا دکھائی، یہ کیا کم ہے۔ باپ کے اگر ہم پر احسان ہیں تو ماں کے بھی تو احسان ہیں۔ اگر ہمیں باپ کے احسانوں کا اعتراف کرنا ہے تو ماں کے احسانوں اور خدمات کا اعتراف بھی تو ضروری ہے۔ بابا اگر اس بنگلہ کو اپنا نام دینے کے لیے تیار نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ ہم اس بنگلہ کا نام ماں کے نام پر رکھیں گے'' .... موہن بولا۔

''بالکل دادا.... دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے جذبات کو ٹھیس بھی نہیں پہنچے گی اور تمہارے دل کی بات بھی پوری ہو جائے گی'' ..... سندر نے دلیپ کو سمجھایا۔

دلیپ کی سمجھ میں بھی ان کی باتیں آ گئیں۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے پوشیا سے اس سلسلے میں بات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ جو آدمی کسی بات کو نہ سمجھتا ہو اور نہ سمجھنے کے لیے تیار ہو اس سے کوئی بات کر کے کیا حاصل۔ یہ طے کیا گیا کہ بنگلہ کا نام ماں کے نام پر ''رکمنی سدن'' رکھا جائے اور بنگلہ کا نام رکمنی سدن رکھ دیا گیا اور اس نام کی تختی بھی بنا کر بنگلہ پر آویزاں کر دی گئی۔

دلیپ وراس کے خاندان والوں نے مہمان کی خوب عزت اور خاطر مدارت کی تھی جس کی وجہ سے ہر کوئی خوش ہو گیا تھا اور انھوں نے ان کے خاندان کو ڈھیر ساری نیک خواہشات اور دعائیں دی تھیں۔ آخری مہمان ساڑھے گیارہ بجے کے قریب رخصت ہوا۔

بنگلہ میں صرف خاندان کے افراد اور رشتہ دار ہی رہ گئے تھے۔ پوشیا کو گیارہ بجے شراب پینے کی اجازت دی گئی تھی۔ وہ شراب پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس دن اس کے سامنے شراب کی گنگا بہہ رہی

تھی ۔ دعوت کے بعد جتنی شراب بچی تھی سب پوشیا نے اپنے قبضے میں لے لی تھی ۔ اس دن اس نے دل کھول کر پی تھی اور پینے کی ساری حدوں کو توڑ دیا تھا۔

پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔

شراب اور کھانا پیٹ میں جاتے ہی اسے نیند ستانے لگی تھی ۔ بنگلے میں اس کے اور رکمنی کے لیے ایک کمرہ بنایا گیا تھا لیکن اس نے اس کمرے یں سونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ طبیلے میں اپنی مخصوص چارپائی پر سونا چاہتا تھا لیکن سب نے اسے وہاں سونے سے منع کیا۔

بہت زور دینے پر وہ صرف اس بات پر راضی ہوا کہ وہ اپنا بستر بنگلہ کے داخلی دروازے کے پاس بنے چبوترے پر لگائے گا۔

اور وہیں لگا کر سو گیا۔

سارا گھر تحفہ تحائف سے بھرا ہوا تھا۔

ان کو جمع کر کے سلیقہ سے ایک کمرے میں رکھنے میں رات کے ڈھائی بج گئے تھے۔

رات کے ڈھائی بجے کے بعد ہی گھر کے تمام افراد سونے کے لیے اپنے اپنے کمرے میں جا سکے۔

☆☆

○

دوسرے دن دلیپ مالتی کے جگانے پر صبح نو بجے جاگا۔

''کتنے بجے ہیں؟'' آنکھ کھولتے ہی اس نے پوچھا۔

''نو بج رہے ہیں۔''

''باپ رے باپ! آج میں نو بجے تک سوتا رہا۔''

''اگر میں نہیں جگاتی تو شاید ۱۲ بجے تک سوتے رہتے'' ......مالتی نے مسکرا کر کہا۔

''کس لیے جگایا؟'' وہ مالتی کی آنکھوں میں پیار سے جھانکتا ہوا مسکرایا۔

''دھیرج بھائی آئے ہیں اور وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں اس لیے جگایا''... مالتی نے مسکرا کر کہا۔

دھیرج بھائی کا نام سنتے ہی وہ اچھل کر پلنگ پر کھڑا ہو گیا۔ دھیرج بھائی ان کا بنگلہ بنانے والا ٹھیکے دار تھا۔ وہ جب ڈرائنگ روم میں آیا تو دھیرج بھائی صوفے پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''شاید میں نے نیند سے جلدی جگا دیا ہے دلیپ بھائی''...دھیرج نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

''کوئی بات نہیں دھیرج بھائی''.. دلیپ نے جواب دیا.... ''آپ نے مجھے نیند سے جگایا تو کوئی ضروری کام ہی ہوگا۔''

''ہاں! ضروری کام تو ہے''.... دھیرج بولا.... ''یہ بتایئے رات کا پروگرام کیسا رہا؟''

''بہت شاندار!'' دلیپ نے جواب دیا'' آپ بھی تو اس میں شریک تھے۔''

''بنگلہ کے بارے میں لوگوں کے کیا تاثرات تھے؟''

''ہر کوئی تعریف کرر ہا تھا۔ تعریفوں کے پل باندھتے نہیں تھک رہا تھا۔''

''شکریہ! بنگلہ میں کوئی کمی؟''

''نہیں نہیں.... بنگلہ میں کوئی کمی نہیں ہے۔''

''کسی نے بنگلہ کے کسی نقص کی طرف اشارہ کیا؟''

''نہیں نہیں.... ہر کوئی غور سے بنگلہ کی ایک ایک چیز دیکھ رہا تھا لیکن کسی نے کسی معمولی نقص کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔''

''اپنا کام ہی ایسا ہوتا ہے دلیپ بھائی''.....دھیرج نے جواب دیا۔

''میں نے آپ کا بہت نام سنا تھا اسی لیے آپ کو یہ کام دیا ہوں''....دلیپ نے مسکرا کو جواب دیا۔

''اب کام کی بات بولوں''.....دھیرج نے پوچھا۔

''ہاں ہاں بولیے۔''

''آپ کا بنگلہ تو مکمل ہو گیا ہے!''

''جی ہاں!''

''دوسرے دو بنگلوں کا بھی آدھے سے زیادہ کام ہو گیا ہے۔

''بالکل''

''تیس لاکھ کے کانٹریکٹ میں میں اپنے حساب سے ۲۲؍لاکھ کا کام کر چکا ہوں۔''

''بالکل........ ۲۲؍لاکھ کا کام تو شاید ہو چکا ہوگا۔''

''لیکن مجھے ابھی تک صرف ۱۵؍لاکھ روپیہ ہی ملا ہے''......دھیرج نے کہا۔

''ہاں ہم نے آپ وصرف پندرہ لاکھ ہی دیے ہیں۔''

''اصل میں مجھے میٹریل والوں کے بل ادا کرنے ہیں۔انھوں نے مال سپلائی روک دی ہے۔اگران کے بل ادا نہیں کیے گئے تو میں آگے کا کام جاری نہیں رکھ پاؤں گا۔اسی وجہ سے آج کام بند ہے اور شاید دو تین دن اور بند رہے''......دھیرج بتانے لگا۔

''اوہو!'' یہ سن کر دلیپ کے ماتھے پر تشویش کی لکریں ابھر آئیں۔

''آپ مجھے آج کل میں سات لاکھ روپیہ دے دیجئے۔میں مٹیریل والوں کے بل ادا کر دیتا ہوں۔مال پھر آنے لگے گا اور ایک دو دن میں پھر کام شروع ہو جائے گا''.......دھیرج نے کہا۔

''ہاں ہاں دھیرج بھائی!......آپ کو پیسہ تو دینا ہے لیکن پیسوں کے لیے آپ کام کیوں بند کر رہے ہیں؟''

''دلیپ بھائی!.....میں کام کہاں بند کر رہا ہوں۔میٹریل والوں نے مال کی سپلائی بند کر دی ہے۔اس لیے مجبوراً مجھے کام بند کرنا پڑا۔ان کے بقایا جات ادا ہوں گے تبھی وہ مال کی سپلائی شروع کریں گے اور میں کام شروع کر پاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے.......میں دو چار لاکھ روپیہ کا انتظام دو دنوں میں کر دیتا ہوں۔''

''دو چار لاکھ نہیں دلیپ بھائی....پورے سات لاکھ.....ساری!میں سات لاکھ کے بنا کام دوبارہ شروع نہیں کر پاؤں گا۔دو چار لاکھ ادا کرنے کے بعد دو چار دنوں کے لیے کام شروع ہوگا۔مال کی سپلائی بند ہو جائے گی تو پھر کام بند ہو جائے گا۔اس لیے دو چار لاکھ سے کام نہیں چلے

گا۔آپ کسی بھی طرح پورے سات لاکھ کا انتظام کردیں تاکہ موہن سیٹھ کا کام مکمل ہونے تک کوئی تکلیف نہ آئے۔" دھیرج نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں دونوں بھائیوں سے بات کرتا ہوں اور پھر آپ کو صورت حال سے آگاہ کرتا ہوں۔"

"مجھے صورت حال سے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں"......دھیرج اٹھتا ہوا بولا" سات لاکھ روپیہ مجھے دے دیجئے تاکہ میں پھر سے کام شروع کرسکوں" یہ کہتا ہوا دھیرج چلا گیا۔

دھیرج کے جانے کے بعد دلیپ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔اس کا بنگلہ مکمل ہو چکا تھا۔اسے دھیرج کو پورے دس لاکھ ادا کردینا چاہیے تھا لیکن اس نے اس وقت صرف پانچ لاکھ ادا کیے تھے۔

سات میں سے پانچ لاکھ تو اسے ادا کرنے تھے۔

اور پانچ لاکھ ادا کرنے کی بات تو دور اس وقت اس کے پاس ایک کوڑی نہیں تھی۔ رات کے پروگرام میں دولاکھ روپیہ سے زائد خرچ ہوا تھا۔وہ بھی اس نے کسی سے ادھار لے کر خرچ کیے تھے۔

اگر کام شروع نہیں ہوا تو موہن اور سندر اس کی جان کھا جائیں گے لیکن تمام باتوں سے آگاہ کرنا انھیں ضروری تھا۔دونوں اس وقت سوئے ہوئے تھے۔ان کا پورا خاندان رات میں اس کے بنگلہ میں رک گیا تھا۔اس نے مالتی سے انھیں جگانے کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں آکر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

"داداتم نے ہمیں بلایا؟"موہن نے پوچھا۔

"ہاں.........دھیرج بھائی آیا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"موہن نے پوچھا۔

"کہہ رہا تھا وہ ۲۲ رلاکھ روپیہ کا کام کر چکا ہے اور اگر اسے دو دنوں کے اندر سات لاکھ

روپیہ نہیں ملا تو آگے کام جاری نہیں رکھ سکتا ہے۔ موہن کا بنگلہ پورا ہونے تک اسے ہر حال میں پیسہ چاہیے۔''

''لیکن مجھے تو صرف پانچ لاکھ روپے دینے ہیں۔ میں ۵ لاکھ روپیہ دے چکا ہوں'' موہن بولا۔ ''میں دو لاکھ دوں گا لیکن تم اپنے باقی پانچ لاکھ روپیوں کا انتظام کرو۔''

''اس وقت میرے پاس پانچ لاکھ روپیہ تو نہیں ہے۔''

''پھر کتنے ہیں؟''

''مشکل سے دو تین لاکھ روپیہ ہوگا۔''

''اس طرح تمہارے بنگلے کا کام شروع ہونے سے رہا'' ..... دلیپ بولا۔

''دادا! تمہارے بنگلے کا کام پورا ہو چکا ہے۔ تمہیں دھیرج کو پانچ لاکھ روپیہ دینا ہے۔ اگر تم وہ پانچ لاکھ روپیہ دے دو تو سارا معاملہ حل ہو جائے گا'' .... سندر بولا۔

''اس وقت میری جیب میں ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے اور میں نہ کہیں سے پانچ لاکھ روپیوں کا انتظام کر سکتا ہوں کیونکہ جو روپے مجھے دھیرج بھائی کو دینے تھے میں ان روپیوں کی بھینس لے آیا ہوں۔''

''یہ تو سراسر دھوکے بازی ہوئی'' .... موہن دلیپ کی بات سن کر تیز لہجے میں بولا۔ ''تمہارے بنگلے کا کام پورا ہو گیا۔ تم نے ٹھیکے داروں کو پورے پیسے نہیں دیے تو ہمارے بنگلوں کا کام رک گیا ہے۔''

''تمہارے بنگلوں کا کام نہیں رکے گا'' دلیپ نے تیز آواز میں کہا .... ''اور یہ کوئی دھوکے بازی نہیں ہے۔ تم اپنے بنگلوں کی تعمیر کے لیے بقایا پانچ پانچ لاکھ مجھے دے دو۔ تمہارے بنگلوں کا کام پورا کروانا میری ذمے داری ہے۔''

''لیکن میرے پاس تو اس وقت اتنے پیسے نہیں ہے'' موہن بولا ... ''اور سچ یہ ہے کہ

میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ میرا..... ۱۰۔۱۲ رلاکھ لوگوں کے پس پھنسا ہوا ہے۔ وہ مل جائے تو میرا مسئلہ حل ہو جائے۔''

''دیکھو اگر میں حصے کے پیسے دھیرج بھائی کو دے بھی دوں اور وہ تمہارے بنگلوں کا کام مکمل بھی کر دے تو تم لوگوں کو تو اپنا باقی پیسہ دینا ہی ہوگا؟ اب تم لوگ کہہ رہے ہو کہ ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے تو پھر کس طرح تمہارے بنگلوں کا کام مکمل ہوگا۔ اسی طرح تمہارے بنگلے ادھورے پڑے رہیں گے اور انھیں زنگ لگ جائے گا۔''

اس پر دونوں نے کچھ جواب نہیں دیا۔

تینوں اپنا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

رات کی تقریب دیکھ کر سندرا اور موہن سنہرے خواب دیکھ رہے تھے کہ کچھ دنوں میں ان کے بھی بنگلے مکمل ہو جائیں گے تو وہ اسی طرح کی شاندار تقریب کا انعقاد کریں گے لیکن سویرے ہی سچائی سامنے آگئی۔

اس درمیان رکمنی بھی جاگ گئی تھی۔ وہ بھی آکر ان کے درمیان بیٹھ گئی تھی۔ تینوں بیٹوں کو اس طرح فکروں میں ڈوبا پایا تو اس سے رہا نہیں گیا اور وہ پوچھ بیٹھی.....

''کیا بات ہے؟ تم لوگ اس طرح سر پکڑ کر کیوں بیٹھے ہو؟''

''رات میں بھگوان نے ہمیں اتنی بڑی خوشی دی..... ہمارے قدم اس شاندار بنگلے میں پہنچے اور سویرے تم لوگ اس طرح اداس بیٹھے ہو..... کیا تم اس خوشی سے خوش نہیں ہو؟''

اس پر دلیپ نے رکمنی کو ساری باتیں سنائی۔ ان کی باتیں سن کر رکمنی بھی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ دیر تک ان کے درمیان خاموشی طاری رہی۔ پھر رکمنی نے اس خاموشی کو توڑا۔

''آخر یہ تو بتاؤ اب تم روپیوں کا بندوبست کس طرح اور کہاں سے کرو گے؟''

''میں سوچتا ہوں ابراہیم بھائی سے کچھ پیسے پیشگی طور پر لے لوں'' دلیپ بولا'' اور انھیں

دودھ کے حساب میں ادا کرتا رہوں گا۔ لیکن وہ بھی ایک دو لاکھ سے زیادہ پیشگی رقم نہیں دیں گے۔''

''میں چاہوں تو دو دن میں میرے پیسوں کا بندوبست کرلوں گا'' موہن بولا ''لیکن میرا سارا دھندہ ٹھپ ہو جائے گا۔''

''میری مجبوری یہ ہے کہ میں کہیں سے بھی ایک پیسہ کا بھی بندوبست نہیں کر سکتا'' سندر نے تاسف سے بولا... ''میرا پیسہ لوگوں کے پاس پھنسا ہوا ہے۔ وہ جب دیں گے تب ہی میں دھیرج بھائی کو پیسہ دے سکتا ہوں۔''

اس کے بعد پھر ان کے درمیان ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ اس دن کام بند تھا۔ کوئی بھی مزدور کام پر نہیں آیا تھا۔ البتہ ان کے سارے ساز و سامان وہاں پر ہی تھے جو اس بات کی امید باندھتے تھے کہ کام شروع بھی ہو سکتا ہے اور اگر دھیرج بھائی اور وہ لوگ چاہیں تو جلد بھی شروع ہو سکتا ہے۔

اگر دھیرج بھائی کو پوری طرح کام بند کرنا ہوتا تو وہ مزدوروں کو حکم دے دیتا کہ اپنا سارا ساز و سامان وہ وہاں سے لے کر چلے جائیں۔

اس دن تو نہیں لیکن دوسرے دن دھیرج بھائی کا فون آیا۔

''کیا ہوا دلیپ بھائی؟ پیسوں کا انتظام ہوا؟''

''میں پیسوں کا انتظام کر رہا ہوں لیکن آپ کام تو بند مت کیجیے۔ اس طرح کام رک جانا اچھی بات نہیں ہے۔ ہماری بدنامی ہو جائے گی۔''

''دلیپ بھائی! میں مجبور ہوں۔ مجھے مال ہی نہیں مل رہا ہے تو میں کس طرح کام کو جاری رکھ سکتا ہوں۔ میرے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ میں سپلائرس کے بقایا جات ادا کر کے مال حاصل کام شروع کرسکوں۔''

''میں کل دو چار لاکھ روپیوں کا انتظام کر دیتا ہوں، دھیرج بھائی آپ کام شروع کروائیے''

دلیپ بولا۔

''کوئی فائدہ نہیں دلیپ بھائی۔ میں آپ سے ملے پیسے سپلائر کو دے کر مال بھیجنے کے لیے کہوں گا۔ انھوں نے پیسہ لے لیا اور مال نہیں بھیجا تو آپ مجھے الزام دیں گے۔ میں کم پیسے انھیں دے کر کوئی رسک نہیں لینا چاہتا کیونکہ اس سے میری بدنامی ہوگی۔ پیسوں کا انتظام ہو جائے تو پیسے بھیجوا دیجئے یا مجھے کال کر دیجئے میں خود پیسے لینے آ جاؤں گا۔ دوسرے دن کام دوبارہ شروع ہو جائے گا۔'' دھیرج نے فون بند کر دیا۔

اس کے لیے یہ بالکل عجیب سا تناؤ تھا۔

اسے اپنے حصے کے پانچ لاکھ روپیہ ادا کرنے تھے اور ایک طرح سے اس کے لیے یہ کام بند ہوا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ اس نے دھیرج کے پیسوں سے بھینس لا کر غلطی کی ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ اس کا فیصلہ درست ہے۔ آج اس کی وجہ سے اسے دو پیسے مل رہے تھے۔

شام کو رکمنی نے اسے بلایا........ ''کیا کام شروع نہیں ہوگا؟''

''نہیں.....دھیرج کا فون آیا تھا.....بنا سات لاکھ کے وہ کام شروع نہیں کرے گا۔''

''پیسوں کا انتظام ہوا؟''

''کہاں سے ہوگا۔ سب ہی حالت تو تمہارے سامنے ہے۔''

اس کی بات سن کر رکمنی سوچ میں ڈوب گئی پھر تھوڑی دیر بعد بولی...''ایک بات کہوں؟''

''کہو.....''

''تم اسے میری کوئی سودے بازی تو نہیں سمجھو گے؟''

''بھلا ایک ماں کبھی اپنے بچوں سے سودے بازی کرتی ہے''.....دلیپ نے ہنس کر کہا۔

''میں تمہیں پانچ لاکھ روپیہ دیتی ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔''

''اچھی بات نہیں ہے۔ آگے کی بات غور سے سنو۔''

''بولو!''

''تمہاری گجرات سے لائی ہوئی دس بھینسوں کی مالک آج کے بعد میں بن جاؤں گی۔''

رکمنی کی اس بات پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ان سے حاصل ہونے والی دودھ کی آمدنی پر بھی صرف میرا حق ہوگا۔''

''ماں.........میری ہر چیز تمہاری ہے۔ تم دس بھینسوں کی بات کرتی ہو میں اپنی پوری ۲۴ بھینسیں تمہیں دے دیتا ہوں۔ ان کی ساری آمدنی تم لے لینا صرف میرے بیوی بچوں کے گذارے کے لائق تھوڑے سے پیسے مجھے دے دیا کرنا''.....دلیپ نے رکمنی پر جذباتی وار کیا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے بیٹے۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ زندگی بھر ایک ایک پیسہ جوڑا ہے۔ میرے پاس اتنا روپیہ آیا ہے تو میں اسے تمہاری طرح اڑانا نہیں چاہتی۔ انھیں سنبھال کر رکھنا چاہتی ہوں اس لیے یہ تجارتی باتیں کر رہی ہوں۔''

''کاش ماں....ہم تمہاری باتوں کو سمجھ پاتے اور ان پر عمل کرتے، تم سے کچھ سیکھتے تو آج یہ نوبت نہیں آتی''.....دلیپ بولا۔

''ٹھیک ہے کل مجھ سے پانچ لاکھ روپیہ لے کر دھیرج بھائی کو دے دینا''......رکمنی بولی۔

''مگر انھیں تو سات لاکھ روپے دینے ہیں۔''

''دو لاکھ موہن سے لے لینا۔ آخر اس کے بنگلے کا کام جو کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے......میں موہن سے بات کرتا ہوں''.........اس نے کہا۔

اس نے موہن کو فون لگا کر تازہ ترین صورت حال سے مطلع کیا اور کہا......

''تم کل تک کسی بھی طرح دو لاکھ روپیوں کا انتظام کرو تاکہ پورے سات لاکھ روپیہ میں

دھیرج بھائی کو دے سکوں اور وہ تمہارے بنگلوں کا کام شروع کر سکے اور یہ بات تم ذہن میں رکھ لو تمہارے بنگلہ کا کام مکمل ہوتے ہی تمہیں بقایا تین لاکھ روپیہ دھیرج بھائی کو دینے ہوں گے تا کہ وہ سندر کے بنگلے کا کام شروع کر سکے۔ اگر تم نے پیسہ دینے میں آنا کانی کی تو تمہارا بنگلہ تو بن جائے گا سندر کا بنگلہ زندگی بھر نہیں بن سکے گا۔''

''نہیں نہیں .... میں پوری کوشش کروں گا کہ دھیرج بھائی کا بقایا وقت پر ادا کر دوں۔ میں دو لاکھ روپیہ آج رات کو ہی لے کر گھر آ جاؤں گا۔ تم کو کل تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں دادا'' .... اس نے فون بند کر دیا۔

وعدہ کے مطابق موہن سچ مچ رات میں دو لاکھ روپیہ لیکر آ گیا۔

''یہ روپیہ تو میرے پاس رکھا تھا۔ باقی روپیہ دھندے میں لگا ہے۔ دھندہ میں صرف نام کا کر رہا ہوں۔ ابھی تک کئی لاکھوں کا گھاٹا اٹھا چکا ہوں۔'' موہن اپنی دکھ بھری کہانی سنانے لگا۔

''دھندہ کرنے نکلے تو یہ سب تو چلتا ہی رہے گا'' ..... دلیپ نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

''یہ روپیہ تم ماں کے پاس دے دو۔ میں سویرے دھیرج بھائی کو فون کروں گا کہ وہ آ کر روپیہ لے جائے'' .... اس نے موہن سے کہا۔

موہن وہ روپیہ لے کر رکمنی کے پاس چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھی رکمنی کے پاس پہنچ گیا۔ ''موہن نے دو لاکھ روپیہ دے دیا۔''

''ماں ... سویرے تم تمہارے پاس کے پانچ اور موہن کے دیے یہ دو لاکھ ..... کل سات لاکھ روپیہ تیار رکھنا تا کہ ہم دھیرج بھائی کو دے سکیں۔''

''میرے پاس روپیہ تیار ہے ..... لیکن موہن سے صاف صاف کہہ دینا کہ آگے کے روپیوں کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہونا چاہیے'' .... رکمنی بولی۔

''موہن سے میری بات ہوگئی ہے۔ موہن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے پاس پیسہ ہے لیکن وہ سارا پیسہ دھندے میں لگا ہوا ہے۔ دھندے سے اتنی بڑی رقم اچانک نکال لی گئی تو دھندے کے چوپٹ ہو جانے کا خطرہ ہے اس لیے وہ ڈر رہا تھا۔ اس کا بنگلہ تیار ہونے میں دو تین مہینے تو لگ جائیں گے تب تک موہن پیسوں کا انتظام کر لے گا لیکن مسئلہ اس کے بعد کا ہے۔''

''اس کے بعد کیا مسئلہ ہے؟''

''سندر کا مسئلہ''

''مطلب؟''

''سندر کے پاس ایک کوڑی نہیں ہے اور چھ مہینے کے بعد بھی شاید اس کے پاس پیسہ آئے۔''

''کیوں؟ اتنے پیسے اس نے کیا کیے؟''

''اس نے لوگوں کو ادھار مال دے رکھا ہے۔ اب ادھاری وصول نہیں ہو رہی ہے۔ اس کا دھندہ بند ہے اور وہ ۱۰، ۱۲/ لاکھ روپیہ کی ادھاری وصول ہو گی بھی یا نہیں اس بارے میں پچھ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔''

''ہے بھگوان! ان بچوں کو دھندہ کرنا نہیں آتا تھا اور دھندہ کرنے نکلے ...تو انجام تو یہی ہوگا اور ہو کر رہے گا۔''

اس نے رکمنی کی بات کا جواب نہیں دیا۔

اس کے بعد اس نے دھیرج بھائی کو فون لگا دیا۔

''بولو دلیپ بھائی!''.....اس کا نمبر دیکھ کر دھیرج نے جواب دیا۔

''آپ کے پیسوں کا انتظام ہو گیا ہے۔ آپ کل سویرے نو بجے آ کر سات لاکھ روپیہ لے کر چلے جائیں اور کل ہی سے کام شروع کر دیں۔''

''پیسہ ملتے ہی دو گھنٹے میں کام شروع کردوں گا۔ میرے سارے مزدور بیکار بیٹھے ہیں۔ میں انھیں ابھی فون کردیتا ہوں۔ وہ سویرے ہی سائٹ پر پہنچ جائیں گے۔ ۹ بجے پیسہ ملنے کے بعد میں ۱۰ بجے تک تمام سپلائرس کے بقایاجات ادا کرکے انھیں نئے مال کا آرڈر دے دوں گا۔ ۱۲ بجے تک سائٹ پر مال پہنچ جائے گا اور ۱۲ بجے سے کام شروع ہوجائے گا''......دھیرج نے کہا۔

''ایک اور درخواست ہے دھیرج بھائی۔''

''بتائیے......''

''اب موہن کا بنگلہ مکمل ہونے تک پیسوں کی مانگ مت کیجئے۔ موہن کا بنگلہ مکمل ہوتے ہی آپ کو اپنے کیے گئے کام کے مطابق پیسے ادا کردیے جائیں گے۔''

''اوکے...دلیپ سیٹھ!...ٹھیک ہے میں موہن کے بنگلہ کا کام مکمل ہونے کے بعد ہی اب بقایا پیسوں کی مانگ کروں گا''......دھیرج نے جواب دیا۔

☆☆

○

اس دوران دو تین ایسے واقعات ہوئے جس نے پوشیا کے پورے خاندان کو توڑ کر رکھ دیا اور انھوں نے کچھ دنوں میں جو کچھ پالیا تھا ریت کے محل کی طرح وہ ڈھ گیا اور سب کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ ابھی تک انھیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ جس زمین پر کھڑے ہو کر بلندی پر جانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ زمین نہیں دلدل ہے۔

دلیپ کے طبیلے میں پتہ نہیں کون سی موذی بیماری پھیل گئی جس کا شکار اس کی بھینسیں ہونے لگیں اور ایک ایک کر کے اس کی بھینسیں مرنے لگیں۔ سویرے ایک بھینس مردہ ملتی۔ ابھی اس کو وہاں سے ہٹانے کا عم شروع بھی نہیں ہوتا کہ دوسری کوئی بھینس تڑپنے لگتی۔ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بیماری کا پتہ لگا کر اس کا علاج کرنے کی کوشش شروع بھی نہیں ہوتی کہ وہ جان توڑ دیتی۔

شام تک دونوں مردہ بھینسوں کو اپنے مقام سے ہٹایا بھی نہیں جاتا کہ کسی اور بھینس کے مرنے کی خبر آتی۔ سویرے جب نوکر بھینسوں کا دودھ دھونے کے لیے اٹھتے تو انھیں ایک اور بھینس مردہ ملتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے صرف دو تین دنوں میں دلیپ کی ساری بھینس مر گئی اور اس کا پورا طبیلہ

،سنسان اور ویران ہو گیا۔ اس کے نوکر، چھیدی اور پوشیا بیکار ہو گئے۔

یہ ایک ایسا صدمہ تھا جس نے دلیپ، پوشیا اور رکمنی کو توڑ کر رکھ دیا۔ دلیپ کی تو ساری کمائی اس میں جاتی رہی۔ رکمنی نے بھی جو پیسہ لگایا تھا سب ڈوب گیا۔

دلیپ کو افسوس اس بات کا تھا کہ اس کی پرانی بھینس بھی اس وبا کا شکار ہو گئی۔

آج اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ سڑک پر آ گیا ہے، اسے اپنا مستقبل تاریک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اتنے بڑے بنگلے اور طبیلے کا مالک ہے لیکن دونوں چیزیں اس کی کس کام کی۔ اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ ہی نہیں بچا ہے جس سے وہ ان دونوں کی دیکھ بھال کر سکے اور نہ کہیں سے کوئی امید ہے کہ جس سے اس کا کاروبار دوبارہ شروع ہو سکے۔

پورے خاندان کو اس بات کا صدمہ تھا۔

سب سے زیادہ صدمہ پوشیا کو ہوا تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے وہ ٹوٹ سا گیا تھا اور صرف شام کو پینے والا پوشیا سویرے بھی پینے لگا تھا کہ اسے اس صدمہ کا احساس نہ ہو۔ کیا کرے دلیپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس صدمہ کی وجہ سے اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا اور تین دنوں تک اسے اسپتال میں رکھنا پڑا تھا۔ اسپتال سے آنے کے بعد بھی وہ بجھا بجھا اور ٹوٹا ٹوٹا سا دکھائی دیتا تھا۔ اس صدمہ کے اثرات نہ تو اس کے ذہن سے زائل ہو سکتے تھے اور نہ زندگی سے۔

اس صدمے سے ابھرنے اور نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے پوشیا کا راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ شراب پینے لگا تھا۔

نیند سے جاگتے ہی شراب پی لیتا تا کہ نشے میں اس کو یہ یاد نہ رہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور آئندہ ایک تاریک زندگی اس کی منتظر ہے۔ مالتی کو اس کا شراب پینا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن وہ دلیپ کے شراب پینے پر صرف اس لیے مطمئن تھی کہ اگر وہ اس صدمہ کو بھلانے کے لیے شراب

پی رہا ہے تو اچھی بات ہے۔ اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹر نے صاف کہا تھا، دلیپ کے ذہن سے اگر اس صدمے کے اثرات زائل نہیں ہوئے وہ اسی بارے یں سوچتا رہا تو اس کا برین ہیمبرج بھی ہو سکتا ہے اور اس پر دل کا دورہ بھی پڑ سکتا ہے۔

اس خوفناک بیماریوں کے تدارک کے لیے اگر دلیپ شراب پی رہا ہے تو بھی اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

پتہ چلا کہ یہ بیماری اکثر بھینسوں کو لاحق ہوتی ہے اور اس سے قبل کہ اس کا کوئی علاج کیا جائے اس کے بچاؤ کا کوئی تدارک کیا جائے یہ بیماری بھینسوں کی جان لے لیتی ہے۔ اس کا دلیپ یا پوشیا کو تو کوئی علم نہیں تھا لیکن چھیدی نے انھیں اس بیماری کے بارے میں بتایا تھا۔

پوشیا کا خاندان اس صدمے سے ابھی ابھرا بھی نہیں تھا کہ اچانک پولیس نے موہن کی دکان پر چھاپا مارا۔ اس کی دکان سے موہن کے مطابق پولیس کو کچھ بھی نہیں ملا مگر پولیس کے نقطہ سے انھیں بہت کچھ مل گیا۔ بڑے پیمانے پر اجناس کا اسٹاک ملا جس کی بنیاد پر پولیس نے کالا بازاری کا کیس بنا دیا۔ کچھ اجناس میں ملاوٹ کے اجزا ملے اس بنیاد پر پولیس نے ملاوٹی اشیا فروخت کرنے، ملاوٹ کرنے کے فرد جرم بھی عائد کر دیئے۔

سیل ٹیکس کا کائی حساب نہیں ملا۔ اس لیے سیل ٹیکس والوں کی مدد سے سیل ٹیکس چوری کا بھی فرد جرم عائد کر دیا گیا۔ پھر انکم ٹیکس والے کب پیچھے ہٹنے اے لے تھے۔ موہن نے دکان کھولی تھی لیکن اس دکان کو چلانے کے لیے شاپ لائسنس نہیں لیا تھا۔ شاپ لائسنس والوں نے بھی اس پر ایک کیس بنا دیا۔ پولیس نے موہن کو حوالات میں ڈال دیا۔

اس کی رہائی کے لیے دلیپ اور سندر کو بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ پولیس، پولیس کے اعلیٰ افسران، لیڈر، نیتا، سیاسی لیڈر، منتری، سنتری، وکیل، کورٹ، کچہری، سرکاری دفاتر کی خاک چھانتے چھانتے ایک طرح سے دونوں کے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔

جو بھی وکیل یا نیتا موہن کے جرائم کے بارے میں سنتا ان کی سنگینی کا احساس انھیں دلاتا اور اس جرم سے ملنے والی سزاؤں کو تفصیل سے سناتا جس کو سن کر دونوں ڈر جاتے۔

ہر جگہ پیسہ پھینکنا پڑتا۔ پولیس اور وکیل اتنا بڑا منہ پھاڑتے کہ کبھی کبھی تو وہ یہ فیصلہ لینے کے لیے مجبور ہو جاتے کہ اس سلسلے میں بھاگ دوڑ نہ ہی کی جائے تو بہتر ہے۔ جو ہو رہا ہے کچھ دنوں میں معمول پر آ جائے گا۔

لیکن موہن کی بیوی نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا اور اپنے سارے گہنے اور نقدی لا کر ان دونوں کے ہاتھوں میں دے دی تھی۔

''بھاؤ جی! چاہے تو یہ سب چلے جائے۔ مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ حوالات میں نہیں رہنا چاہیے۔ میں تو مر جاؤں گی اور میرے بچے ان کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتے ہیں۔''

پولیس کو لاکھوں روپیہ رشوت دی گئی، وکیلوں نے اونچی فیس وصول کی۔ یہاں تک کہ ججوں سے رابطہ قائم کیا گیا اور آخر بڑی مشکل سے موہن کی ضمانت ہوئی۔ اس پر کیس تو بن گیا تھا اب کیس چلتا رہے گا۔

سیل ٹیکس اور انکم ٹیکس کے آفسوں میں نوٹوں کے ڈھیر نذرانہ کے طور پر پیش کر کے کیس کو ختم تو نہیں کیا گیا لیکن کیس کی سنگینی کو کم کیا گیا۔ اس طرح ۸ سے ۱۰ دنوں میں موہن کی ساری جمع پونجی لٹ گئی۔ جب وہ حوالات سے باہر آیا تو نہ دھندہ کرنے کے قابل تھا اور نہ اس دھندے کو دوبارہ شروع کرنے کے۔

اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے وہ دوبارہ اپنا دھندہ شروع کر سکے۔ اس پر اتنے کیس تھے کہ ہفتے میں دو تین بار اسے عدالت، پولیس اسٹیشن اور سرکاری دفاتر کا چکر لگانا پڑتا تھا۔

ابھی یہ معاملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ رکمنی نے کوئی جیپ خریدی تھی ور کرایہ پر ایک آدمی کو

دی تھی اس نے اس نئی جیپ سے ایک آدمی کو اڑا کر اس کا ایکسیڈنٹ کر دیا۔ وہ آدمی تو جگہ پر مر گیا لیکن ایکسیڈنٹ میں جیپ کا ۶۰ رفیصدی نقصان ہو گیا۔

ایک نیا کیس شروع ہو گیا تھا۔ پولیس وہ جیپ اٹھا لے گئی تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے ایک نئی دوڑ بھاگ شروع ہو گئی۔ اسے کئی دنوں کے بعد جدو جہد اور لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد جیپ ہاتھ آئی تو انشورنس کمپنی نے انشورنس دینے سے انکار کر دیا۔

کیونکہ غلطی ڈرائیور کی تھی۔ اس نے اس وقت شراب پی رکھی تھی۔ اس جیپ کو گیرج میں ڈالا گیا اور اپنی طور پر اس کا کام کیا گیا۔ جیپ تیار ہو گئی لیکن اتنی اچھی نہیں بن سکی۔ ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ چند ماہ قبل ہی خریدی ہوئی جیپ ہے۔

اسے دوبارہ اصلی حالت میں لانے میں لاکھوں روپیہ خرچ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد رکمنی نے اسے کرائے پر دینے کا ارادہ دل سے نکال دیا اور وہ جیپ اب دلیپ کے بنگلے کے سامنے ہی کھڑی رہتی تھی اور گھر کی ضرورت کے لیے اس کا استعمال ہوتا تھا۔ دلیپ، موہن اور سندر جیپ چلانا جانتے تھے۔ اس لیے ڈرائیور کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ گھر والوں کے کہیں آنا جانا ہوتا تو اس جیپ کی وجہ سے بڑی سہولت ہو جاتی تھی۔

تیسرا اور سب سے بڑا حادثہ سندر کے ساتھ ہوا۔

سندر ایک بلڈر سے اپنے بقایا جات مانگنے گیا۔ اس پر بلڈر نے سندر کی ادھاری دینے سے صاف انکار کر دیا۔ معاملہ لاکھوں روپیہ کا تھا اور سندر کافی دنوں سے ضبط وتحمل سے کام لے رہا تھا۔ اس دن وہ بلڈر کے اس طرح کے جواب پر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے بلڈر کی پٹائی شروع کر دی۔ بلڈر نے اپنی حفاظت کے لیے دو غنڈوں کو پال رکھا تھا۔ اپنے مالک کو پیٹتا دیکھ کر انھوں نے سندر پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ قریب ہی تھا کہ وہ سندر پر حملہ کر کے اسے چاقو سے بری طرح زخمی کر دیتے لیکن سندر اس کے لیے پہلے سے ہی تیار تھا۔ اس نے نہ صرف بڑی خوبی سے

خود کو بچاتے ہوئے ان کا حملہ ناکام کر دیا بلکہ انکے ہاتھوں سے چاقو بھی چھین لیا۔

اب چاقو سندر کے ہاتھ میں تھا۔ اگر وہ تینوں راہ فرار اختیار کر لیتے یا خودسپردگی کے لیے تیار ہو جاتے تو معاملہ ٹل بھی جاتا لیکن اس کے باوجود وہ تینوں نے مل کر سندر پر حملہ کر دیا۔ اب سندر کی باری تھی۔ اس کو خود کا بچاؤ بھی کرنا تھا اور ان تینوں کو خود سے دور بھی رکھنا تھا۔

اس وقت اس پر ایک جنون طاری ہو گیا تھا۔ اس نے کسی مشاق چاقو باز کی طرح چاقو چلانا شروع کر دیا۔ جو بھی اس کی چاقو کی زد میں آتا چاقو اس کے جسم پر ایک گہرا نشان بنا دیتا جس سے اس کا خون بہنے لگتا۔ مد مقابل کو زخمی دیکھ کر ان کا بہتا خون دیکھ کر سندر کا جوش اور زیادہ بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ تینوں بھی ہار نہیں مان رہے تھے۔ اس لیے سندر کا جوش بڑھتا ہی جا رہا تھا اور اسے تو ہر حال میں ان تینوں سے خود کی حفاظت کرنی تھی۔ جیسے ہی وہ تینوں اس پر حملہ کرتے سندر اپنی حفاظت میں ان تینوں پر چاقو سے بے دریغ وار کرتا۔ ان کے ہونٹوں سے چیخیں نکلتیں۔

اس کے بعد سندر پر جیسے ایک جنون سوار ہو گیا۔ جو بھی ملتا وہ اس پر چاقو سے وار کرتا جاتا۔ تھوڑی دیر بعد خون سے لت پت زخموں سے چور ہو کر تینوں زمین پر گر پڑے۔ تینوں کو آس پاس والوں نے اسپتال پہنچایا اور پولیس میں رپورٹ لکھائی۔

پولیس سندر کی تلاش میں نکلی اور اس نے سندر کو گرفتار کر لیا۔ تینوں اسپتال میں تھے اور تینوں کی حالت بے حد نازک تھی۔ ان کا اچھا علاج ہو رہا تھا اس لیے وہ زندہ تھے ورنہ اگر تھوڑی بھی لاپرواہی برتی جاتی تو اس میں سے ایک دو آسانی سے مر جاتے۔

پولیس نے سندر کو گرفتار کیا اور اس پر ایسے ایسے دفعات لگا دیئے جنھیں سن کر ہر وکیل چکرا جاتا۔ قتل کی کوشش، غنڈہ گردی، ہاف مرڈر پتہ نہیں کیسی کیسی دفعات پولیس نے سندر پر لگا دی اور اسے عدالت میں پیش کر کے اس کو آٹھ دنوں کی پولیس کسٹڈی مانگ لی۔

اس سے پہلے کہ دلیپ اور موہن کچھ کرتے سب کچھ ہو گیا تھا۔ انھوں نے سندر کو بچانے کی، اسے ضمانت پر چھڑانے کی لاکھ کوشش کی، بڑے بڑے وکیلوں سے رجوع کیا، ان کی منہ مانگی فیس دی لیکن سندر کو تو ۸ ردنوں کی پولیس کسٹڈی مل چکی تھی۔

سب نے بتایا تھا کہ پولیس کسٹڈی کو مطلب ہوتا ہے مکمل طور پر پولیس کے رحم وکرم پر رہنا.........اور پولیس کسٹڈی میں پولیس انتہائی بے رحمی سے ملزم کی پٹائی کرتی تھی۔ پولیس کی مار سے سندر کو بچانے کے لیے پولیس کو ایک لاکھ رشوت دینی پڑی۔

آٹھ دن سے پہلے تو اس کی ضمانت مشکل تھی۔

اس لیے آٹھ دنوں تک انتظار کیا گیا۔

آٹھ دنوں کے بعد پولیس نے سندر کو عدالت میں پیش کیا اور رپورٹ دی کہ سندر نے جب لوگوں کو مارا ہے اس میں سے ایک کی حالت بہت نازک ہے ۔اس کی کبھی بھی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اس لیے عدالت ملزم کو ضمانت نہ دے۔

پولیس کی بات مان کر سندر کو ضمانت نہیں دی گئی اور اسے ۱۵ ردنوں کی عدالتی تحویل میں رکھنے کا حکم دے دیا۔ اس بار سندر کو ۱۵ ردنوں کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ اگلی بار پولیس نے جب سندر کو عدالت میں پیش کیا تو اس پر نئے الزامات اور دفعات لگا کر اس سلسلے میں تحقیق کرنے کے لیے سندر کی کسٹڈی بڑھانے کی درخواست دی، جسے عدالت نے فوراً منظور کر لیا۔

اور سندر کو ایک بار پھر ۱۵ ردنوں کے لیے عدالت میں جیل بھیج دیا گیا۔ تینوں زخمیوں کی حالت سدھر رہی تھی مگر وہ یہ ظاہر کر رہے تھے جیسے ان کی حالت ابھی بھی تشویش ناک ہے۔ اور ان کی جان پر خطرہ منڈلا رہا ہے۔ دلیپ اور موہن ایک وکیل سے دوسرے وکیل کے پاس دوڑ رہے تھے۔

جو بھی وکیل کیس ہاتھ مین لیتا پولیس کے لگائے دفعات کو دیکھتے ہی پہلے ہی صاف کہہ

دیتا" پولیس نے جو دفعات لگائے ہیں اس کی رو سے تو سندر کو چھ مہینے سے پہلے ضمانت مل نہیں سکتی ہے۔ کوشش کرنا میرا کام ہے میں پوری کوشش کروں گا لیکن عدالت راضی ہوتی ہے یا نہیں، سندر کو ضمانت ملتی ہے یا نہیں اس بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا........ میری اس کیس کے لیے فیس ایک لاکھ روپیہ ہے۔ ان دفعات کے لیے کیس لڑنے کی فیس دو لاکھ سے کم نہیں لیتا ہوں۔"

وہ جب بھی سندر سے ملنے جیل میں جاتے وہ ان کو دیکھ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔

"دادا! مجھے جلدی اس جہنم سے نکالو..... میرا دل ایک لمحہ بھی اس جہنم میں رہنے کو نہیں چاہتا ہے۔ اگر مجھے اس جہنم سے نہیں نکالا گیا تو یا تو میں مر جاؤں گا یا پورا بدمعاش، چھٹا ہوا سفاک غنڈہ بن کر جیل سے باہر نکلوں گا۔"

اس پر وہ اسے سمجھاتے کہ وہ اس کی ضمانت کے لیے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں تھوڑا وقت لگ سکتا ہے۔ تھوڑے وقت کی بات سنتے ہی سندر بھڑک اٹھتا۔

"نہیں دادا نہیں! تھوڑا وقت تو کیا میں ایک گھنٹہ بھی اب اس جہنم میں رہنا نہیں چاہتا۔"

"تو تم کیا سوچتے ہو کہ ہم تمہاری رہائی کے لیے کوشش نہیں کر رہے ہیں؟"

"آپ کر رہے ہیں...... لیکن کتنے دن اور نہیں کے۔ میرے لیے تو ایک ایک لمحہ یہاں کاٹنا دشوار ہو گیا ہے۔ پوری جیل میں چھٹے ہوئے بدمعاش غنڈے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں میں خود کو بڑا بے بس محسوس کرتا ہوں۔ وہ مجھ پر رعب جماتے رہتے ہیں اور مجھ سے اپنے وہ کام کرواتے ہیں جو میں نے کبھی زندگی میں بھی نہیں کیا ہے۔"

"تم صبر سے کام لو۔ ہم نے ایک بہت بڑے وکیل کی خدمات حاصل کی ہے۔ اسے اونچی فیس ادا کی ہے۔ اس بار تمہاری ضمانت ہو جائے گی........"

"اگر میں کچھ دن اور اس جیل میں رہا تو یا تو میں مر جاؤں گا یا اس جیل میں بند غنڈوں سے بھی بڑھ کر غنڈہ بن کر جیل سے باہر آؤں گا۔"

سندر ایسی ایسی باتیں بتا تا تھا کہ انھیں سن کر ان کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ وہ آ کر گھر کوئی بھی بات نہیں بتاتے تھے۔ انھیں ڈر تھا اگر سندر کی ایک بھی بات گھر والوں کو معلوم ہوگئی تو انھیں سخت صدمہ ہوگا۔

سندر کی بیوی رات دن پاگلوں کی طرح روتی رہتی تھی اور بس ایک ہی رٹ لگائے رہتی تھی ''میرے سارے زیورات لے لو۔ کسی طرح انھیں میرے پاس لے آؤ۔''

ادھر رکمنی کا بھی وہی حال تھا۔ رات دن اٹھتے بیٹھتے سندر کو یاد کرتی تھی۔

''پتہ نہیں میرا سندر کس حال میں ہوگا؟''

''پتہ نہیں میرے سندر کو جیل میں ٹھیک سے کھانا ملتا بھی ہوگا یا نہیں؟''

''پتہ نہیں وہ کب آئے گا...؟''

''گھر کے لوگ بھی کتنے بے مروت ہیں۔ میرے بیٹے کو جیل سے لانے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ میں تو کہتی ہوں میرے سارے زیورات لے لو کیونکہ اب تو میرے پاس ان زیورات کے علاوہ کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ ان زیورات کے بدلے میں اگر میرا سندر گھر آجائے بھی تو بھی کافی ہے۔''

ایک دن وکیل نے انھیں اپنی آفس میں بلایا۔

''دیکھو! میں نے اچھی طرح ساری باتیں معلوم کر لی ہیں جو الزامات، دفعات سندر پر لگائے گئے ہیں اور جو صورت حال ہے اس کے مطابق سندر کو اس بار بھی ضمانت ملنی بہت مشکل ہے۔ لگتا ہے جج سے بات کرنی پڑے گی۔''

''پھر وکیل صاحب آپ دیر کس بات کے لیے کر رہے ہیں۔ جج سے بات کیجئے نا۔''

''شاید تم کو نہیں معلوم جج سے بات کرنے کی فیس ایک لاکھ روپیہ ہے۔''

''ہم ایک لاکھ روپیہ دینے کو تیار ہیں لیکن اس بار ہمارا سندر جیل سے باہر آجانا چاہیے۔

اگر وہ اس بار گھر نہیں آیا تو اس کی بیوی اور ہماری ماں کی جان کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں جج صاحب سے بات کرتا ہوں''....وکیل بولا۔

''آپ اس کی فیس کل میرے آفس میں جمع کر دیں۔''

ان کے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔

اس نے جب گھر میں بات کی تو ماں اور سندر کی بیوی اپنے زیورات دینے کو تیار ہو گئیں۔

کسی طرح ایک لاکھ روپیہ وکیل کے آفس میں جمع کرایا گیا اور اس تاریخ کو سندر کی ضمانت ہو گئی۔

وہ اپنے گھر آ گیا۔

☆☆

پوشیا کے خاندان پر بہت برا وقت چل رہا تھا۔ سندر جیل سے باہر آ گیا تھا لیکن اس کے پولیس اسٹیشن اور کورٹ کے چکر جاری تھے۔ اس دو وقت پولیس اسٹیشن میں حاضری دینی پڑتی تھی۔ موہن کے کیس بھی دن بدن الجھتے جا رہے تھے۔

دلیپ کا طبیلہ بھی خالی پڑا تھا۔ اس کے پاس دو بھینس خریدنے کے بھی پیسے نہیں تھے اور نہ ہی طاقت۔ نہ ہی کہیں سے پیسہ حاصل کرنے کا کوئی راستہ دکھائی دیتا تھا۔ موہن کے بنگلے کا کام رک گیا تھا۔

کام تو تقریباً پورا ہو گیا تھا صرف کھڑکی دو دروازے، فرش، اسکینگ اور کلر کا کام باقی تھا۔ اس کے لیے دھیرج بھائی نے دو لاکھ روپے مانگے تھے۔ موہن خود اتنا پریشان تھا کہ اسے اپنے کیس لڑنے کے لیے وکیلوں کو فیس دینے کے پیسے نہیں تھے تو بھلا وہ اپنے بنگلے کا کام پورا کرنے کے لیے دھیرج بھائی کو دو لاکھ روپیہ کہاں سے لا کر دیتا۔

وہ خود اب اس بنگلے سے بیزار ہو گیا تھا۔ اس کا یا اس کے خاندان کا دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ کام مکمل ہو اور وہ اس میں آ کر رہیں۔ اس لیے انھیں دھیرج بھائی کے کام بند کر دینے پر بھی

کوئی دکھ نہیں ہو رہا تھا۔ سندر کے بنگلے کو تو دھیرج بھائی نے عرصے سے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس کا صرف ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا۔ سندر تو اس پوزیشن میں تھا ہی نہیں کہ وہ اس بنگلے کا کام شروع کرنے کے بارے میں سوچے۔

دونوں کی دکانیں بھی بند ہو چکی تھیں۔ بند دکانوں کا انھیں کرایہ ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لیے انھوں نے دکان مالکوں کو واپس کر دی اور دیئے گئے ڈپازٹ میں سے بقایا کرایہ کاٹ کر روپیہ واپس لے لیا۔

اس طرح ان کے ہاتھ میں دو پیسے آئے تھے۔ ان کے روزمرہ کے اخراجات کے لیے کام آنے لگے۔ انھوں نے شہر میں جو فلیٹ کرایے پر لیے تھے ان بھی انھیں کرایہ ادا کرنا پڑ رہا تھا جو اتنا زیادہ تھا کہ اس وقت ان میں کرایہ ادا کرنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ اس لیے انھیں فلیٹ خالی کرنے پڑے۔

وہ فلیٹ خالی کر کے اپنی پرانی جگہ کھیت میں آ گئے اور تینوں بھائی مل کر دلیپ کے بنگلے میں رہنے لگے۔ موہن کے ادھورے بنگلے کے دو کمرے میں صفائی کر کے وہاں رات کو سونے کے لیے جگہ بنالی گئی۔

دلیپ بھی بیکار تھا۔ اس کا دھندہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ وہ دوسرا دھندہ شروع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پرانا دھندہ شروع کرنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اخراجات نے انتہا بڑھ چکے تھے۔

اونچی سطح کی زندگی جینے کے وہ عادی ہو گئے تھے۔ اب اس زندگی کو وہ چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ پیسہ تھا تو اس زندگی کو جینا بیحد آسان تھا۔ اب کوئی آمدنی ہی نہیں تھی تو اس زندگی کو جینا تو دور پرانی زندگی گذارنا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ تینوں سویرے گھر سے نکل جاتے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتے رہتے اور رات کو واپس گھر آ جاتے۔ سندر اور موہن کو تو اپنے

کیس کے سلسلے میں کبھی کبھی پولیس اسٹیشن یا کورٹ جانا پڑتا تھا لیکن دلیپ کے لیے تو کوئی جگہ تھی ہی نہیں۔ چھوٹے موٹے کام کرنا اب وہ اپنی شان کے خلاف سمجھنے لگا تھا۔

ادھر ادھر بھٹک کر یا کسی سیاسی پارٹی کے دفتر میں بیٹھ کر وہ اپنا وقت گذارتا اور شام کو واپس گھر آجاتا پھر وہ رکمنی کی جیپ کو کرائے کے طور پر چلانے کے لیے جانے لگا۔ اگر اسے کوئی چھوٹا موٹا گاہک مل جاتا تو کرایے پر اسے اپنی جیپ اور خدمت دیتا۔ جو پیسے ملتے شام کو خوشی خوشی لے کر گھر آتا لیکن ایسا ضروری نہیں تھا کہ روز کرایہ مل جائے۔ کبھی کبھی دو دنوں تک کوئی نہیں ملتا تھا اور کوئی ملتا تو اتنا کم کرایہ دیتا کہ اس کرایے میں کام کرنے کو دلیپ کا دل نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح دن گذر رہے تھے۔

ایک رات سارا خاندان پھر ایک ساتھ جمع ہوا اور سنجیدگی سے ان حالات، اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کے بارے میں لگا۔ ان کی اس میٹنگ میں پوشیا شامل نہیں تھا۔ وہ شراب پی کر سو گیا تھا۔

ان دنوں پتہ نہیں پوشیا میں کہاں سے اتنی سنجیدگی آگئی تھی۔ اب وہ شراب پینے کے بعد کسی کو گالیاں نہیں دیتا تھا۔ چپ چاپ سو جاتا تھا۔ دن بھر بھی چپ چاپ اپنے کاموں میں لگا رہتا تھا۔ کوئی بات کرتا تو اس سے بات کرتا اور اس کے ساتھ بڑا شفقت بھرا برتاؤ کرتا تھا۔ اس کی کسی بات پر بھڑکتا نہیں تھا اور نہ اس کی کسی خطا پر اسے گالیاں دیتا تھا۔

خاندان والوں نے عرصے سے پوشیا کی گالیاں نہیں سنی تھی۔ وہ اپنے خاندان کی حالت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے خاندان پر کیا کیا مصیبتیں آئیں اور کیا کیا بلائیں اس کے خاندان سے چھٹی ہے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ چپ چاپ یہ گردش روزگار کے یہ کھیل دیکھ رہا تھا۔ اس بارے میں کبھی کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔

یہاں تک کہ رکمنی اسے کھانا کھلاتے وقت اسے ساری باتیں بتاتی بھی تو چپ چاپ سن

لیتا تھا۔ اس پر کوئی بھی ردعمل ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس دن انھوں نے پوشیا کو نہیں بلایا تھا کیونکہ وہ پھر ایک بار ایسے موضوع پر بات کرنے والے تھے کس کو سن کر پوشیا بھڑک سکتا تھا اور سارے کیے کرائے پر پانی پھر سکتا تھا۔

وہ اپنی زندگی کی تازہ ترین صورت حال پر گفتگو کر رہے تھے جس میں رکمنی بھی شامل تھی۔

''ماں...... ہمارا ہمارے خاندان کا کیا ہوگا کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے؟ تم ہی بتاؤ اس سے نکلنے کا کیا کوئی راستہ ہے؟'' .... دلیپ نے رکمنی سے پوچھا۔

''اب میں کیا راستہ بتاؤں میری تو خود سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں !میں بوڑھی بھلا کیا کوئی راستہ بتا سکتی ہوں۔ میں تو کبھی گھر سے باہر بھی نہیں نکلتی اور نہ میں نے دنیا دیکھی ہے میں تو صرف اپنے خاندان کے درمیان ہی رہی ہوں اور میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے خاندان پر بہت برا وقت آیا ہے۔ ہمارا بہت برا وقت چل رہا ہے۔''

''سب سے برا وقت میرا چل رہا ہے ماں'' .... دلیپ رکمنی سے بولا ''لوگ سنیں گے تو ہنسیں گے۔ میں اتنے شاندار بنگلے کا مالک ہوں مگر کبھی کبھی اس بنگلے میں چائے کے لیے دودھ بھی نہیں رہتا ہے۔ دو ماہ سے بجلی کا بل ادا نہیں کر پا رہا ہوں۔ اس لیے کبھی بھی بنگلے کی بجلی کٹ سکتی ہے اور ہمارا شاندار بنگہ اندھیرے میں ڈوب سکتا ہے۔''

''میرے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ میں نے جو دکان دھندہ شروع کیا تھا وہ بند ہو چکی ہے۔ میرے پاس اسے دوبارہ شروع کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس سے بہتر میں نوکری کر کے زندگی گذارتا تھا لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ میں نوکری بھی نہیں کر سکتا۔ مہینے میں دس بار کورٹ، کچہری، پولیس اسٹیشن اور سرکاری دفاتر میں جانا پڑتا ہے۔ نوکری کرتے ہوئے تو یہ سارے کام ممکن نہیں ہیں۔ میرا بنگلہ تقریباً تیار ہے۔ تھوڑا سا کام باقی ہے لیکن وہ تھوڑا سا کام کرنے کے لیے میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے اور اب میرا دل اس شاندار بنگلے میں رہنا

بھی نہیں چاہتا۔ میری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے تو پھر بھلا اس شاندار بنگلے میں رہ کر اس شاندار بنگلے کے اخراجات کس طرح برداشت کروں گا؟''

''اس سے بہتر تو میں کسی جھونپڑے میں رہنا چاہوں گا۔ دلیپ دادا جب تک اپنے بنگلے میں مجھے اور میرے خاندان کو رکھے گا رہوں گا ورنہ پھر کھیت میں کوئی چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر اس میں رہنے لگوں گا۔'' موہن کی جذباتی باتیں سن کر سب جذباتی ہو گئے۔

''ارے دلیپ کو، اپنے بڑے بھائی کو کیا اتنا مفاد پرست سمجھ رکھا ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی، اس کے خاندان کو گھر سے نکال دے گا۔ تم دونوں میرے بھائی ہو۔ یہ بنگلہ بھی تمہارا ہے۔ تم لوگ جب تک چاہو اس بنگلے میں رہ سکتے ہو۔ کسی دلیپ یا کسی مالتی کی مجال نہیں کہ وہ تمہیں بنگلہ سے باہر نکال سکے'' موہن کی باتوں سے دلیپ بھی جذباتی ہو گیا۔

''سب سے خراب حالت میری ہے۔ میں اور میرا خاندان دلیپ دادا کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ نہ میں کچھ کرنے کی حالت میں آج ہوں اور نہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آگے بھی میں کوئی کام نہیں کر پاؤں گا کیونکہ میرے پاس اپنا کوئی کام شروع کرنے کا ذریعہ ہی نہیں ہے۔ میرا سارا پیسہ ادھاری میں ڈوب گیا ہے۔ ایک جگہ ادھاری مانگنے گیا تو اتنا بڑا بکھیڑا کھڑا ہو گیا۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ایک دوسری جگہ اپنی ادھاری مانگنے گیا تھا تو اس نے فون کر کے پولیس بلا لیا اور پولیس مجھے گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن لے گئی اور شاید میرے ریکارڈ دیکھتے ہوئے مجھ پر ایک اور غنڈہ گردی کا کیس بنا دیتی لیکن انسپکٹر کو میں نے ساری بات سمجھائی تو اس کی بات سمجھ میں آئی اور اس نے مجھے چھوڑ دیا لیکن صاف وارننگ دے دی کہ آج تو چھوڑ رہا ہوں لیکن آگے تمہارے بارے میں میرے پاس کوئی بھی شکایت آئی تو تمہارے پرانے ریکارڈ کی بنیاد پر تمہارے خلاف کاروائی کرنے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ اس کے بعد تو کسی سے اپنا پیسہ مانگنے کو بھی ڈر لگتا ہے۔'' ....

سندر نے اپنی کہانی سنانے لگا۔

''آخران باتوں کا کوئی حل ہے؟''

''حل ہے.......حل نہ ہوا ایسا ہو ہی نہیں سکتا؟''.....موہن بولا۔

''وہ کیا حل ہے؟''.....رکمنی نے پوچھا۔

''اگر آج ہم تینوں بھائیوں کے پاس چالیس پچاس لاکھ روپیہ آجائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم پھر سے اٹھ کھڑے ہو جائیں گے اور اپنے قدموں پر چلنے لگیں گے۔ ہم پھر سے اپنے پرانے دھندے نئے تجربات کی روشنی میں کر سکتے ہیں''.....موہن بولا۔

''لیکن ہمارے پاس چالیس پچاس لاکھ روپیہ کہاں سے آئے گا؟''......رکمنی بولی۔

''اسی طرح جس طرح پہلی بار آیا تھا۔''

''میں سمجھ نہیں سکی؟''.......رکمنی نے پوچھا۔

''ماں سیدھی سی بات ہے۔ پچھلی بار ہم نے اپنی زمین کا ایک ٹکڑا فروخت کیا تھا تو ہمارے پاس ایک کروڑ روپیہ آیا تھا۔ اس بار اگر ہم اپنی زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا فروخت کر دیں تو چالیس پچاس لاکھ روپیہ آسکتا ہے اور ہم پھر سے ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔''

''اب اگر تم نے اپنی زبان سے زمین کا ٹکڑا تو دور اگر ایک انچ زمین بھی فروخت کرنے کی بات نکالا تو تمہارا باپ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا''.......موہن کی بات سن کر رکمنی بولی۔

''یہ بات تو ہم بھی جانتے ہیں۔ اس لیے تو اس بات کو زبان پر لانے کی ہمت نہیں کر رہے تھے''.....دلیپ بولا''لیکن ماں تم ہی بتاؤ؟ کیا ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ ہے؟''

''نہیں.....ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔''.....رکمنی نے جواب دیا۔

''اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمارا باپ ہمیں اب ایک انچ بھی زمین فروخت کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔''

''ہاں یہ بھی سچ ہے''.....رکمنی بولی۔

''تو اب کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟ ہم جس حال میں جی رہے ہیں اسی حال میں جئیں گے؟'' دلیپ نے بے بسی سے جواب دیا۔

''کیا ہم ایک بار بھی اس سلسلے میں بابا سے بات کرنے کی کوشش نہ کریں؟''

''کوشش نہیں جرأت کر کے تو دیکھو'' ..... دلیپ بولا

''بابا نے تمہارے ٹکڑے نہیں کیے تو نام بدل دینا'' .... موہن بولا۔

اس کے بعد ان چہروں پر مایوسی کی گھٹائیں چھا گئیں۔

بہت دیر تک کوئی کچھ نہ بولا۔ چپ چاپ سب سر جھکائے کچھ سوچتے رہے۔ پھر سندر نے دھیرے سے پوچھا۔

''ماں! کیا تم بھی یہ کوشش نہیں کر سکتی؟''

''اگر یہ بات میں نے زبان پر لائی تو تمہارا باپ میرے بھی ٹکڑے کر دے گا'' رُکمنی نے جواب دیا۔

اس کے بعد پھر کاموشی چھا گئی۔

''انجام چاہے کچھ بھی ہو'' .. تھوڑی دیر بعد دلیپ بولا ''ہمیں ایک بار کوشش تو کرنی چاہیے۔''

''ایک آخری کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟'' سندر نے ساتھ دیا۔

''ایسا کرتے ہیں'' ..... موہن بولا ''ہم سب بابا کے پاس جاتے ہیں اور اسے آخری بار اپنی زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا فروخت کرنے کی بات کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے....... ہمیں منظور ہے'' ..... سب ایک آواز بولے۔

''چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے'' ..... دلیپ بولا۔

پھر یہ طے کیا گیا کہ وہ سب مل کر کل سویرے اس سلسلے میں پوشیا سے بات کریں گے۔

دوسرے دن سویرے پھر سب دلیپ کے ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے تھے اور پوشیا کو بلانے کے لیے دلیپ کا لڑکا گیا تھا۔

سب نے اپنے آپ کو تیار کرلیا تھا۔ وہ سب پوشیا کی گالیاں سننے کو تیار تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے پوشیا کی مار کے لیے بھی خود کو تیار کرلیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس میٹنگ کا نتیجہ منفی ہی آئے گا لیکن وہ پھر بھی ایک جھوٹی امید دل میں سجائے تھے۔ انھوں نے اپنا سر پٹک پٹک کر زخمی کرلیا اور پھوڑ بھی ڈالا تو پوشیا ان کی بات نہ سنے گا اور نہ مانے گا لیکن پھر بھی وہ ایک آخری کوشش کرنے کی تیاری کرنے میں لگے تھے۔

پوشیا جب دلیپ کے لڑکے کے ساتھ آیا تو ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

''کیا بات ہے؟ آج سب جمع ہیں؟ اور مجھے کیوں بلایا ہے؟''.... آتے ہی اس نے سب کو گھورنا شروع کر دیا۔

''بیٹھو بابا! بہت دنوں سے تمہارے ساتھ بیٹھنے کا موقع نہیں ملا ہے''........ سندر نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو جلدی اور صاف صاف کہو''.... پوشیا نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''بابا ! تم تو جانتے ہی ہو ہمارا پورا خاندان آج کل مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے۔ میری ساری بھینسیں مرگئی ہے۔ میرے طبیلے میں ایک بھینس بھی نہیں ہے۔ میرے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں ہے کہ کم سے کم ایک بھینس خرید سکوں۔ جس سے کم سے کم گھر کے دودھ کی ضرورت پوری ہو''.... دلیپ نے شروعات کردی۔

''ہاں بیٹا! تمہارے ساتھ بھگوان نے جو کیا بہت برا کیا.... اس بات کا مجھ بھی احساس ہے۔ تمہارا ابھرا پرا طبیلہ کسی اجڑے چمن کی طرح اجڑ گیا۔ تمہارے طبیلے میں ایک بھینس بھی نہیں

رہی۔ میرا بھی دل تمہاری بھینسوں کی خدمت کرنے سے لگا رہتا تھا۔ میرا بھی وقت کٹتا تھا۔ چھیدی کے روپ میں اتنا اچھا نوکر ملا تھا وہ بیچارہ بھی چلا گیا کیا کرتا۔ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی کام نہیں تھا نہ ہم اس کی تنخواہ دے سکتے تھے۔''..... پوشیا کہنے لگا۔

''اب صورت حال یہ ہے کہ اس بڑے سے شاندار بنگلے میں کبھی کبھی چائے کے لیے بھی دودھ نہیں ہوتا ہے کیونکہ ہمیں استعمال کا دودھ بھی باہر سے خریدنا پڑتا ہے''......دلیپ بولا۔

''ہاں! جانتا ہوں بیٹا''..... پوشیا افسوس سے بولا۔

''دلیپ سے برا حال میرا ہے بابا''.....موہن بولا.....''کئی مہینوں سے میرے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ میرا سب کچھ کیس میں ختم ہو گیا ہے۔ نیا دھندہ شروع کرنے کے لیے میرے پاس پیسہ نہیں ہے اور اب میں کسی دکان پر کام بھی نہیں کر سکتا۔ اتنے شاندار بنگلے میں رہنے والا بھلا کسی دکان میں نوکری کر سکتا ہے؟ یہ شاندار بنگلہ بھی روزانہ میرا منہ چڑھاتا ہے۔ پورا کام مکمل ہو گیا ہے ہے تھوڑا سا کام باقی ہے لیکن میرے پاس اس تھوڑے سے کام کرنے کو پیسے نہیں ہیں اور کام کر کے بھی کیا کروں۔ اگر اس بنگلے میں رہنے کے لیے آؤں گا تو اس بنگہ کی بجلی کا بل بھرنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہوں گے''موہن نے اپنی کہانی سنائی۔

''ہاں بیٹا! تمہارے ادھورے بنگلہ کو جب بھی دیکھتا ہوں میرے دل کو ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ کہاں میں خواب دیکھ رہا تھا میرے تینوں بیٹوں کے تین شاندار بنگلے ہوں گے۔ ایک بنگلہ تو بن گیا، دوسرے ادھورے بنگلے روز میرا منہ چڑاتے ہیں''..... پوشیا بھی جذباتی ہو گیا۔

''میری تو یہ طاقت ہے کہ میں شاید ہی اس جنم میں اپنے ادھورے بنگلے کا کام پورا کر سکوں۔ میرے پاس اپنے خاندان والوں کو دو وقت کی روٹی کھلانے کے لیے پیسے نہیں ہیں تو بھلا میں کس طرح یہ ادھورا بنگلہ بنا سکتا ہوں۔ نہ میرے پاس کوئی کام دھندہ ہے نہ میں کوئی نیا دھندہ شروع کر سکتا ہوں۔''سندر نے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی۔

''میں جانتا ہوں میرے بچو! تم جس حالت سے گذر رہے ہو اس حالت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کہاں ہم معمولی لوگ تھے۔ معمولی لوگوں کی طرح رہتے تھے لیکن کس شان سے مل جل کر رہتے تھے۔ اچانک ہماری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا اور ہم معمولی لوگوں سے بڑے لوگ بن گئے۔ اس وقت میرا دل تمہیں دیکھ دیکھ کر کتنا خوش ہوتا تھا۔ مجھے جو خوشی تمہیں، تمہارے کاروبار کو دیکھ کر ملتی تھی میں بیان نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر تقدیر نے پلٹا کھایا۔ پتہ نہیں ہم سے کیا پاپ ہو گیا جس کی وجہ سے بھگوان ہم سے ناراض ہو گیا اور اس نے ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا جو اس نے ہمیں اچانک دے دیا تھا اور ہم پھر آسمان سے زمین پر آ گئے۔ اس بارے میں سوچا ہوں تو کبھی کبھی مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی ہے۔ کیا میرے بچے زندگی بھر اس حال میں رہیں گے؟ کیا اس صورت حال سے نپٹیں گے؟ قسمت کے اس بھنور سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟''

''راستہ تو ہے بابا''..... موہن بولا۔

''راستہ ہے تو پھر اس راستے پر چل کر اس بھنور سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتے؟'' پوشیا نے حیرت سے پوچھا۔

''کیونکہ وہ راستہ ایسا راستہ جس پر چلنے کے لیے ہم تو خوشی خوشی راضی اور تیار ہیں لیکن تم اس راستے پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہو گے''...... موہن بولا۔

''کیسی باتیں کرتا ہے رے پگلا! ارے کوئی باپ اس راستے کو بھلانا پسند کر سکتا ہے جس میں اس کی اولاد کی بھلائی اور ترقی ہو''..... پوشیا بولا۔

''نہیں بابا! وہ راستہ ہی ایسا ہے جس پر چلنے کے لیے تم کبھی تیار نہیں ہوں گے'' دلیپ بولا۔

''آخر وہ کون سا راستہ ہے میں بھی تو دیکھوں؟ جس پر تم لوگ تو چلنا چاہتے ہیں لیکن میں چلنا نہیں چاہتا۔''

''بہت آسان سا راستہ ہے بابا'' سندر بولا.... ''اگر آج بھی ہمارے پاس چالیس پچاس لاکھ روپیہ آجائے تو سب کچھ صحیح ہو جائے گا۔ دلیپ کا طبیلہ بھینسوں سے بھر جائے گا۔ میرے اور موہن کے بنگلے بن جائیں گے اور ہم پھر کوئی نیا دھندہ شروع کر سکیں گے۔ جس سے ہمیں اتنا تو مل ہی سکتا ہے کہ ہم آرام سے اپنے شاندار بنگلوں میں رہ سکیں اور ساری تکلیفوں سے نجات حاصل کر لیں گے۔''

''لیکن ہمارے پاس چالیس پچاس لاکھ روپئے کہاں سے آئیں گے؟'' پوشیا نے پوچھا... ''کون دے گا یا کون ہمیں چالیس پچاس لاکھ روپئے دے سکتا ہے؟''

''ہمارے پاس چالیس پچاس لاکھ روپیہ دوبارہ اسی طرح آسکتا ہے۔ جس طرح پہلی بار آیا تھا'' موہن بولا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' .... پوشیا الجھن میں پڑ گیا۔

''سیدھی سی بات ہے۔ اگر ہم ہماری زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا....... پوری زمین نہیں، چھوٹا سا ٹکڑا بھی فروخت کر دیں تو ہمارے پاس آج بھی چالیس پچاس لاکھ روپئے آسکتے ہیں اور ہم پھر سے ایک نئی شاندار زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ اگر تم ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا فروخت کرنے کے لیے تیار راضی ہو جاؤ۔''

موہن نے کہہ تو دیا تھا لیکن اس نے پوشیا کی گالیاں سننے یا خود کو اس کی مار سے بچانے کے لیے تیاری بھی کر لی تھی۔ موہن کی بات سن کر پوشیا کا چہرہ تن گیا۔

اچانک اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رینگ گئی اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے۔ پوشیا کی اس حالت کو دیکھ کر سب گھبرا گئے۔

''میرے بچو! میرا جو کچھ ہے سب تمہارا تو ہی ہے'' پوشیا بولا... ''میرا کیا میں آج مرا، کل میرا دوسرا دن مگر میرے ہوتے ہوئے میرے بچے تکلیف اٹھائیں تو میری زندگی پر لعنت ہے۔

اگر زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو فروخت کرنے سے میرے بچوں کے سارے دکھ دور ہو سکتے ہیں۔ ان کو ایک نئی زندگی مل سکتی ہے، وہ ایک نئی زندگی کی شروعات کر سکتے ہیں تو زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کیوں.........میں اپنی پوری زمین فروخت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ سب تمہارا ہے اور تمہاری بھلائی کے لیے تمہارے کام آئے میرے لیے اس سے بڑھ کر بات کیا ہو سکتی ہے؟ جاؤ ....تم زمین کے لیے گاہک ڈھونڈو...........رجسٹری کی تاریخ طے کرو۔ تم جب مجھ سے کہو گے میں خوشی خوشی زمین فروخت کرنے کے کاغذات پر انگوٹھا لگا دوں گا۔''

پوشیا کی باتیں سن کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ کبھی حیرت سے پوشیا کو تو کبھی اس کے سر کے اوپر لگی بھگوان کی تصویر کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆

○

ڈیل دو کروڑ میں فائنل ہوئی تھی۔

اگر موہن اور سندر تھوڑے صبر سے کام لیتے تو دس بیس لاکھ روپیہ اور بڑھ سکتے تھے کیونکہ معاملہ ایسا تھا کہ امیت شاہ کو ان کی زمین کی سخت ضرورت تھی اور انھیں بھی اپنی زمین فروخت کرنا بے حد ضروری تھا۔ لیکن دونوں اپنی اپنی ضرورت ایک دوسرے پر ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ دلیپ نے تو طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی ضرورت امیت شاہ پر ظاہر نہیں کرے گا۔

لیکن سندر اور موہن کی بے صبری نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور امیت پر یہ آشکار ہو گیا کہ جس طرح اسے اس زمین کی سخت ضرورت ہے ان لوگوں کو بھی اس زمین کو فوری طور پر فروخت کرنا ہے۔ شاید انھیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔

وہ جب ممبئی سے اپنے گھر سے نکلا تھا تو اس نے ذہن بنا لیا تھا کہ آج وہ اس زمین کی ڈیل کو فائنل کر کے ہی رہے گا اور دل ہی دل میں اس نے اس ڈیل کی قیمت بھی طے کر لی تھی۔ آج اگر دلیپ نہیں مانے تو وہ اس زمین کی قیمت دو کروڑ پچیس لاکھ کر دے گا لیکن ایسا کچھ بھی اسے کرنا نہیں پڑے گا۔

۲ رکروڑ کی قیمت سنتے ہی دلیپ کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا مگر سندر اور موہن کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ ان کے چہروں سے بے چینی ٹپکنے لگی اور چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی۔

انھیں لگا اب وہ اس سے آگے بالکل نہیں بڑھے گا اور صاف کہہ دے گا وہ نہ تو اس سے زیادہ قیمت بڑھا سکتا اور نہ ان کے ساتھ زمین کا یہ سودا کر سکتا ہے۔ اس لیے دلیپ کے جواب دینے سے پہلے ہی موہن اور سندر نے جواب دے دیا۔

''ٹھیک ہے ہمیں یہ سودا منظور ہے۔''

دونوں کی بات سنتے ہی امیت شاہ کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی تو دلیپ کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرے۔

''موہن، سندر..... یہ کیا کر رہے ہو؟''

''دادا ! اب چھوڑو یہ بھاؤ تاؤ اور دو کروڑ پر فائنل کر دو۔''

دونوں کی بات سن کر دلیپ دونوں کو کھینچتے ہوئے آفس کے باہر لے گیا اور آفس کے باہر ان کے درمیان بحث ہونے لگی اور بعد میں جھگڑا بھی۔

جب تینوں دوبارہ آئے تو سندر اور موہن کے چہرے اترے ہوئے تھے اور دلیپ کے چہرے پر تناؤ تھا۔

''ٹھیک ہے امیت بھائی بولی آگے بڑھایئے۔''

''کیسی بولی.........ڈیل تو فائنل ہو چکی ہے''.....امیت نے مسکرا کر کہا۔

''میں نے فائنل کہاں کی ہے؟''.......دلیپ بولا۔

''تمہارے بھائی تو فائنل کر چکے ہیں۔''

''ان کے فائنل کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بولی تو میں بول رہا تھا''...دلیپ نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے'' امیت شاہ نے بھی پینترا بدلا....''میں بولی دو کروڑ سے آگے نہیں بڑھا

سکتا۔ دو کروڑ میں ڈیل فائنل کرنی ہے تو کرلو ورنہ یہ سودا کینسل سمجھو۔''

امیت شاہ نے آخری حربہ استعمال کر دیا۔

اس نے ایسا کرتے ہوئے کافی بڑا رسک لیا تھا لیکن وہ بڑی دیر سے تینوں بھائیوں کے چہروں اور ان کی ذہنی حالت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسے دلیپ کافی منجھا ہوا اور گھاگ لگ رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں سندر اور موہن اناڑی کھلاڑی لگ رہے تھے۔ بولی دلیپ نے شروع کی تھی اور اتنی دیر تک اس کے اور دلیپ کے درمیان بولیاں لگ رہی تھیں۔ اگر سندر اور موہن مداخلت نہیں کرتے تو وہ بولی آگے بڑھاتا لیکن سندر اور موہن کے درمیان میں کودنے سے ان کی قیمت کا اسے پتہ چل گیا تھا۔ اس لیے اس نے بولی روک دی تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ اب وہ تینوں اس قیمت پر اسے زمین فروخت کر کے ہی اٹھیں گے۔ اس لیے اس نے صاف کہہ دی کہ اب وہ بولی آگے نہیں بڑھا سکتا ہے۔

اب وہ بڑے اطمینان سے دلیپ کی بے بسی اور سندر اور موہن کی بے چینی دیکھ رہا تھا۔ دلیپ کے دل میں تھا کہ وہ اس وقت سودے کی بولی کی بیٹھک سے اٹھ کر چلے جاتے اور زمین کے لیے کوئی دوسرا گاہک تیار کرتے لیکن موہن اور سندر چاہ رہے تھے کہ دلیپ اسی وقت ڈیل کو ڈن کر دے اور امیت شاہ کے ساتھ اس وقت اس قیمت پر ڈیل ڈن کر کے اٹھے۔

دلیپ بھی اپنے بھائیوں کے جذبات بھانپ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ سودے کی بیٹھک سے اٹھ گیا تو موہن اور سندر اس پر بھوکے کتوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے اور اس سے جھگڑا کرنے لگیں گے۔ اس لیے اس نے آخری بار بے بسی سے دونوں کی طرف دیکھا اور ڈیل ڈن کر دی۔ وہ سوچ رہا تھا سودے کے لیے ان دونوں کو لا کر بہت بڑی بھول کی ہے۔ ویسے اس علاقہ میں جو قیمت چل رہی تھی امیت شاہ نے اتنی ہی قیمت لگائی تھی۔

اس قیمت پر ڈیل فائنل کرنے کا انھوں نے گھر میں ہی طے کر لیا تھا لیکن دراصل وہ

امیت شاہ کو ٹٹولنا چاہتا تھا۔ وہ تو بے حد ضرورت مند ہیں انھیں اپنی زمین فروخت کرنی ہی ہے۔ اس لیے ان کی منہ مانگی قیمت اگر مل جائے تو زمین فروخت کرنے میں کوئی برائی نہیں تھی لیکن اس نے ایک پتہ پھینکنے کی کوشش کی۔

اگر امیت شاہ ضرورت مند ہوا اور سچ مچ اسے یہ زمین خریدنا ہی ضروری ہو تو پھر دس بیس لاکھ روپیہ قیمت بڑھ بھی سکتی ہے۔ مگر موہن اور سندر کی نادانی اور ناسمجھ نے پانسہ پلٹ دیا تھا۔ انھوں نے امیت شاہ پر ظاہر کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ ضرورت انھیں ہے۔ اس لیے انھوں نے ڈیل ڈن کر دی تھی۔

دراصل دلیپ کو پتہ تھا کہ امیت شاہ کو ان کی زمین میں دلچسپی ہے۔ اڑتی اڑتی خبریں ان کے پاس آئی تھی کہ امیت شاہ ان کی زمین خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن اس وقت انھیں زمین فروخت نہیں کرنی تھی۔

پوشیا اس وقت زمین فروخت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ امیت شاہ نے ان کی پوری تاریخ نکال لی تھی کہ زمین کے فروخت میں کیا کیا مشکلات ہیں۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ زمین پوشیا کے نام پر ہے جو زمین فروخت کرنا نہیں چاہتا ہے۔ یہ تینوں بھائی زمین کا سودا کرنے آئے ہیں لیکن زمین کی رجسٹری پر انگوٹھا پوشیا کو لگانا ہے۔ اس لیے لگے ہاتھوں ان کی اس مجبوری کا فائدہ اٹھالیا جائے اور سلسلے میں اس نے ذہن میں ایک منصوبہ بنالیا تھا۔

''تو ڈیل فائنل ہوگئی نا!'' .....امیت نے آخری بار تینوں کی طرف دیکھا۔

''ہاں! فائنل ہے'' .....دلیپ نے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے اب سودے کی رجسٹری کے بارے میں ڈیل کر لی جائے۔''

''رجسٹری کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کہیں تو ہم دو دن میں رجسٹری کر کے دے سکتے ہیں'' ....دلیپ نے کہا۔

''دلیپ بھائی دو کروڑ کا معاملہ ہے اور دو کروڑ روپیہ دو دن میں جمع نہیں کیا جا سکتا۔''
امیت شاہ نے کہا تھا...... ''پیشگی کے طور پر آج کل میں میں تمہیں پچاس لاکھ دے سکتا ہوں لیکن رجسٹری ایک مہینہ کے بعد ہوگی اور رجسٹری پر تمہیں......''

''امیت بھائی بہت دیر ہو جاتی ہے۔ آٹھ دن کے اندر رجسٹری کریئے نا!'' دلیپ نے کہا۔

''نہیں دلیپ بھائی۔ آٹھ دنوں میں اتنے پیسوں کا بندوبست نہیں ہو سکے گا۔''

''کوئی بات نہیں امیت بھائی۔'' ایک بار پھر موہن نے مداخلت کی... ''آپ آج پچاس لاکھ روپیہ دے دیجئے۔ فی الحال ہمیں پچاس لاکھ روپئے کی ہی ضرورت ہے۔ رجسٹری ایک ماہ بعد کریں گے۔''

ایک بار پھر موہن نے گڑبڑ کر دی تھی۔ دلیپ نے ضبط سے کام لیا ورنہ اس کا دل تو چاہ رہا تھا موہن کی اس حرکت پر اس کے منہ میں ایک زوردار تھپڑ رسید کر دے۔

''ٹھیک ہے پیشگی کے میں آج ہی ۵۰/لاکھ روپیہ دے دیتا ہوں اور اگریمنٹ کی ایک اور شرط بھی سن لیجیے۔''

''وہ کیا ہے؟'' دلیپ نے امیت شاہ کا منہ تاکا ''اگر ٹھیک ایک ماہ بعد مقررہ تاریخ کو رجسٹری نہیں ہوگی اور اگر کسی وجہ سے آپ لوگ یہ سودہ کینسل کرتے ہیں تو آپ لوگوں کو پیشگی لیے روپیہ پر ۳/فیصدی روزانہ کے حساب سے سود دینا ہوگا اور فی دن ایک لاکھ روپیہ کے حساب سے جتنے دن بعد ڈیل کینسل ہوگی، دوسرا جرمانہ الگ۔''

تینوں کو امیت شاہ کے جرمانے کا حساب سمجھ میں نہیں آیا لیکن ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا اور نہ اس شرط میں کوئی نقصان کی بات تھی۔ اگر پوشیا رجسٹری کے کاغذات پر انگوٹھا لگانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو یہ شرط کافی مہنگی ثابت ہو سکتی تھی لیکن ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پوشیا کا ذہن زمین

فروخت کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس لیے کسی بھی شرط پر ڈن کرنے میں اگریمنٹ تیار ہوگیا۔ اگریمنٹ تینوں کے نام سے تیار ہوا تھا اور اس پر شاہ کے ساتھ تینوں نے دستخط کیے۔ شاہ پچاس لاکھ روپیہ اپنی جیب میں ڈال کر اپنے گھر کی طرف چل دیے۔

راستہ بھر تینوں میں بحث وتکرار ہوتی رہی۔

دلیپ دونوں کی بے وقوفی کے بارے میں انھیں سمجھاتا رہا کہ اگر وہ عجلت سے کام نہیں لیتے تو دس بیس لاکھ روپیہ اور بڑھ سکتے تھے۔ انھیں درمیان میں کودنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

شاہ کو ان کی زمین کی ضرورت تھی۔ اسے یہ پہلے سے علم تھا، اس لیے وہ سیدھا شاہ کے پاس گیا تھا اور دوسرے دن شاہ نے آ کر ان کی زمین بھی دیکھی تھی جبکہ وہ اس سے قبل کئی بار دیکھ چکا تھا۔ شاہ ضرورت مند تھا۔ ضرورت مند تو وہ بھی تھے لیکن ان دونوں نے غلطی کر دی اپنی ضرورت شاہ پر ظاہر کر دی۔ اس لیے امیت شاہ نے ۲ رکروڑ کے آگے قیمت نہیں بڑھائی۔

لیکن وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے اس بات پر اطمینان ظاہر کر رہے تھے کہ ان کی زمین کی قیمت ۲ رکروڑ ہے۔ انھوں نے سودا دو کروڑ میں ہی کیا ہے۔ اس لیے یہ کوئی گھاٹے کو سودا نہیں ہے۔

ایک بار پھر گھر میں پچاس لاکھ روپیہ آیا تھا۔

اور ایک بار پھر ان کے دن بدلنے والے تھے۔ اس لیے اتنے روپیوں کو دیکھتے ہی پورے گھر میں ایک بار پھر خوشی کا ماحول چھا گیا۔ اس دن ان نوٹوں کو دیکھ کر پہلی بار پوشیا کے چہرے پر بھی خوشی کے تاثرات دکھے تھے۔

بچے خوشی سے ناچ رہے تھے۔ گھر کی عورتوں کی آنکھوں سے جو کئی دنوں سے ناامیدی اور مایوسی جھلک رہی تھی اچانک غائب سی ہوگئی تھی اور اس کی جگہ ان کی آنکھوں سے خوشی اور مسرت ٹپکنے لگی تھی۔ پیسہ گھر میں آتے ہی مستقبل کی منصوبے بندیاں بھی شروع ہوگئی تھی۔ پیسوں

کی تقسیم اسی طرح طے کرنا طے کیا گیا تھا جس طرح اس سے قبل ہوئی تھی۔

یعنی دلیپ، موہن اور سندر کے حصے میں پچاس پچاس لاکھ آئیں گے۔ پچاس لاکھ رکمنی لے گی اس میں وہ اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی حصہ دے گی۔ اس وقت ملے سارے پیسے رکمنی کے حوالے کر دیئے گئے اور یہ طے کیا گیا کہ سب اپنی ضرورت کے مطابق رکمنی سے پیسہ لے کر کام چلائیں۔ ایک ماہ بعد جب رجسٹری ہو جائے گی اور پورے پیسے آ جائیں گے تو پھر پوری رقم تقسیم کر دی جائے گی۔

''مجھے سب سے پہلے اپنے طبیلے کے لیے گجرات سے ۲۴ر بھینسیں لانی ہے تا کہ میرا طبیلہ آباد ہو اور میرا کاروبار شروع ہو اور آمدنی بھی شروع ہو۔ اس لیے مجھے فوری طور پر ۱۲ر لاکھ روپیوں کی ضرورت ہے''...دلیپ نے اپنی مانگ سب کے سامنے رکھ دی۔

''ہاں! بیٹا تم سب سے پہلے اپنے طبیلے کے لیے بھینس لے آؤ۔ جانور کے بنا میرا دل ہی نہیں لگتا ہے۔ میں بیمار ہو گیا ہوں، میرا وقت بھی نہیں کٹتا۔ پہلے کاموں میں لگا رہتا تھا تو وقت بھی کٹتا تھا'' پوشیا نے بھی دلیپ کی تائید کی...''اور سب سے پہلے چھیدی کو ڈھونڈ کر واپس لاؤ۔ پتہ نہیں وہ کہاں کام کر رہا ہوگا۔ طبیلہ سنبھالنے کے لیے اس سے بہتر کوئی آدمی نہیں ہے۔''

''میں چھیدی کو لے آؤں گا'' دلیپ نے کہا ''مجھے پتہ ہے وہ اس وقت کہاں کام کر رہا ہے۔''

''مجھے فوری طور پر پانچ لاکھ روپیہ چاہیے'' موہن نے اپنی مانگ پیش کی....''تا کہ میں دو لاکھ روپیہ دھیرج بھائی کے منہ پر مار کر اس کو بنگلہ کا ادھورہ کام کرنے کے لیے کہہ سکوں اور شہر میں کرائے سے کوئی دوسری دکان دیکھ سکوں۔''

''ہاں ماں! موہن کے بنگلے کا کام بھی شروع ہونا چاہیے۔'' دلیپ نے تائید کی....'' اسے پانچ لاکھ روپیہ دے دینا۔''

"میرے کام کا تو ابھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے"....سندر بولا...."اس لیے میں سوچتا ہوں کہ اپنی نگرانی میں اپنے بنگلے کا کام پورا کرلوں۔"

"ٹھیک ہے" دلیپ بولا...."موہن کے بنگلے کا کام پورا ہونے کے بعد دھیرج بھائی تمہارے بنگلے کا کام بھی شروع کردے گا۔"

اب جتنی زمین میں ان تینوں کے بنگلے اور دلیپ کا طبیلہ تھا، زمین کا اتنا ہی حصہ ان کی ملکیت تھی۔ طبیلہ کے پیچھے اور سندر کے بنگلہ کے پاس کا حصہ فروخت ہو چکا تھا۔

زمین خریدنے کے بعد امیت شاہ تو اپنی زمین کے گرد کمپاؤنڈ بنانے ہی والا تھا۔ اس لیے یہ طے کیا گیا کہ اپنی ملکیت کی زمین کے گرد وال کمپاؤنڈ بنا لیا جائے تاکہ ان کی زمین محفوظ ہو جائے اور دیوار بن جانے کے بعد ان کے بنگلے اور طبیلے میں کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔

اس پر جو چار پانچ لاکھ روپیہ خرچ آئے گا وہ تو خرچ کرنا ہی تھا۔

انھیں اس بات کا قطعی کوئی دکھ نہیں تھا کہ اب ان کے پاس زمین کھیت نہیں رہا۔ وہ کسان تھے لیکن اب کسان نہیں رہے ہیں کیونکہ وہ کبھی کھیت میں کام ہی نہیں کرتے تھے۔ کھیتوں میں کام کرنا ان کے لیے بہت محنت کا کام تھا اور ان کی نظر میں کھیتوں سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی ہے جتنی آسانی سے دوسرے کام کرنے سے ہو جاتی ہے۔ اس لیے بھومی ہر ہو جانے کا نہ تو انھیں دکھ تھا اور نہ احساس۔

پوشیا کے دل کے کسی کونے میں یہ احساس رہا ہوگا لیکن اپنے خاندان والوں کے دمکتے چہرے دیکھ کر اس احساس کو وہ زبان پر نہیں لا رہا تھا۔

اس نے طے کرلیا تھا کہ اب وہ اپنی اولاد کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔ ان کی خوشی میں ہی اس کی خوشی ہے۔ موہن نے رات کو ہی دھیرج بھائی کو فون کر کے بلایا تھا۔ دھیرج بھائی آٹھ بجے رات کو ان کے گھر آیا...."دھیرج بھائی! یہ رہے آپ کے دو لاکھ روپے...." کہتے

ہوئے اس نے دولاکھ روپیوں کے نوٹوں کی گڈیاں دھیرج بھائی کی طرف اچھالی اور بولا......

''کل سے میرے بنگلے کا کام شروع ہو جانا چاہیے اور آٹھ دن کے اندر یا جتنی جلدی مکمل ہو سکے بنگلہ تیار کر دیں۔''

''پیسوں کی ہی تکلیف تھی موہن بھائی'' دھیرج نوٹوں کی گڈیاں ہاتھوں میں لے کر ان کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولا ..... ''ورنہ میرے لیے کون سا مشکل کام ہے۔ کل سویرے ہی کھڑکیاں، دروازے، ماربل، سیمنٹ، ریتی پہنچ جائے گا اور دوپہر تک کام شروع ہو جائے گا۔''

''پندرہ دن کے اندر آپ کا بنگلہ تیار ہو جائے گا۔ اس کے بعد میرے بنگلے کا کام شروع کرنا ہے، دھیرج بھائی'' سندر بولا۔

''بالکل آپ بھی پانچ لاکھ روپیوں کا انتظام کر کے رکھیں۔ آپ کا کام بھی فوراً شروع ہو جائے گا'' دھیرج بولا.....

''پیسوں کا اب کوئی مسئلہ نہیں ہے، دھیرج بھائی، کہو تو ابھی آپ کو پانچ لاکھ روپیہ دے دوں۔''

''نہیں سندر بھائی! ابھی پیسہ نہ دیں۔ جب میں آپ کے بنگلے کا کام شروع کروں گا اس وقت پیسہ دیجیے گا۔ فی الحال مجھے موہن بھائی کے بنگلے کا کام پورا کرنا ہے'' ...دھیرج نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے! پہلے موہن کے بنگلے کا کام کر دو۔ وہ کوئی زیادہ کام بھی نہیں ہے'' ...سندر بولا۔

''ٹھیک ہے موہن بھائی .... میں کل سے کام شروع کر دیتا ہوں۔'' نوٹوں کی گڈیوں کو اپنے ہاتھ کے بیگ میں ڈال کر دھیرج نے دونوں سے ہاتھ ملائے اور چلا گیا۔ دوسرے دن سے وعدہ کے مطابق دھیرج بھائی نے موہن کے بنگلے کا کام شروع کر دیا۔ وعدے کے مطابق تمام ضروری سامان کھڑکیاں، دروازے، ماربل، سیمنٹ، ریت وغیرہ ۱۱ر بجے آ گئے تھے اور وہ بنگلے کی صاف صفائی میں لگ گئے تھے۔ میٹریل کے آتے ہی کام شروع ہو گیا۔

دھیرج بھائی خود مال کے ساتھ آیا تھا اور اس کے اپنے کام والوں کو ہدایت دے دی تھی کس طرح سے کام شروع کریں اور ابتدا میں کیا کیا کام کریں۔ موہن اسی کے ساتھ ساتھ تھا۔

''موہن سیٹھ، اگر کچھ زائد کام کروانا ہو یا پھر ماربل، دروازے، ووڈ وغیرہ کی کوالٹی میں کوئی فرق کرنا ہو تو ابھی سے کہہ دو.... ساتھ میں کام ہو جائے گا'' دھیرج نے موہن کو ٹوکا۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان کے پاس بہت پیسے ہیں۔ اب اسے پیسوں کے لیے کام بند کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بلکہ یہی موقع ہے وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر موہن سے زائد کام کرا کے پیسہ کما سکتا ہے۔ موہن کے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بنگلہ کا سارا فرنیچر پلنگ، صوفہ، الماریاں وغیرہ بیڈ روم کی الماریاں سب ماربل یا گرینائٹ کی بنائی جائیں تا کہ وہ مضبوط بھی رہے اور خوبصورت بھی۔

''کوئی مسئلہ نہیں'' دھیرج موہن کی بات سن کر بولا... ''میں بالکل بنا سکتا ہوں۔ صرف آپ بتائیں کہاں پر کیا کیا بنوانا ہے تا کہ میں اس کے خرچ کا تخمینہ آپ کو دے سکوں....''

اس پر موہن نے اپنی بیوی کو بلایا۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی نے دھیرج کو پورے بنگلہ میں کیا کیا کہاں اور کتنا بڑا بنانا ہے؟ کس طرح بنانا ہے وہ بتایا۔

دھیرج ان کی ساری باتیں نوٹ کرتا رہا۔ ساری باتیں نوٹ کرنے کے بعد بولا۔

''ٹھیک ہے میں اپنے کاریگروں سے اس کے خرچ کا تخمینہ نکال کر آپ کو مطلع کرتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں.... آپ خرچ کا ایک تخمینہ بتا دیں۔ اس کے بعد میں طے کروں گا کہ یہ کام کروانا ہے یا نہیں'' موہن بولا۔

''نہیں نہیں دھیرج بھائی'' موہن کی بیوی بولی ''ایسی بات نہیں ہے مجھے یہ سارے کام کروانا ہی ہے۔ آپ صرف اس کا بجٹ بتا دیں۔''

''میں شام تک فون کر کے آپ کو بجٹ بتا دوں گا۔''

دھیرج بھائی چلا گیا تو موہن اور اس بیوی دیر تک اس سلسلے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ واپس دلیپ کے بنگلے کی طرف چل دیے۔

دور سے ہی انھوں نے دیکھا پوشیا چبوترے پر بیٹھا بری طرح کھانس رہا ہے۔ دونوں دوڑ کر اس کے پاس گئے۔

''کیا بات ہے بابا؟ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟'' انھوں نے پوشیا سے پوچھا۔

''پتہ نہیں بیٹا''..... پوشیا نے کھانستے ہوئے کہا.... ''آج بہت کھانسی آ رہی ہے اور سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔''

پوشیا کی پشت پر ہاتھ پھیرنے کے لیے جیسے ہی موہن کی بیوی نے ہاتھ لگایا تو ایک دم سے اس نے اپنا ہاتھ واپس لے لیا۔ پوشیا کا جسم بخار سے کسی بھٹی کی طرح تپ رہا تھا۔

''بابا! تم کو تو بہت تیز بخار ہے''......وہ پوشیا سے بولا۔

''ہاں ہو! پتہ نہیں کیا بات ہے۔ رات کو اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی اور بخار محسوس ہونے لگا تھا۔ میں سمجھا سویرے تک ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہ بڑھتا ہی جا رہا ہے''..... پوشیا بولا۔

''اب یہاں پر مت بیٹھو۔ چلو اندر گھر میں چل کر آرام کرو۔ اگر آرام نہیں ہوا تو تم کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں''..... موہن نے کہا اور پوشیا کو سہارا دے کر اٹھایا۔

پوشیا کبھی گھر میں جا کر آرام کرنے کے لیے راضی نہیں ہوتا تھا لیکن اس دن وہ موہن کا سہارا لے کر رکمنی کے کمرے کی طرف بڑھا اور رکمنی کے پلنگ پر جا کر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆

○

دلیپ نے گجرات جانے کی پوری تیاری کر لی تھی لیکن اس دن پوشیا کی طبیعت کچھ زیادہ ہی بگڑ گئی۔ ابھی تک اسے ڈاکٹر کے پاس کے جا کر دوائیاں لائی جا رہی تھی لیکن اس دن پوشیا میں چلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ اس لیے ڈاکٹر کو گھر لانا پڑا۔

ڈاکٹر اطمینان سے پوشیا کو اچھی طرح چیک کرنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب! دس بارہ دن ہو گئے ہیں کوئی آرام نہیں ہو رہا ہے'' دلیپ ڈاکٹر سے بولا۔ ''ہم دوائیں تو برابر لا رہے ہیں لیکن کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا ہے۔ تیز کھانسی آتی ہے، تیز بخار آتا ہے، سانس اکھڑنے لگتی ہے، کمزوری کی وجہ سے غشی طاری ہو جاتی ہے۔ حالت میں کوئی سدھار نہیں آ رہا ہے۔''

''میرا مشورہ ہے اب آپ یہ چھوٹے موٹے ڈاکٹروں کا علاج بند کریں اور کسی اچھے بڑے ڈاکٹر کو بتائیں''......ڈاکٹر بولا۔

''کس کو بتائیں''......موہن نے پوچھا۔

''میں ایک ڈاکٹر کے نام چٹھی لکھ کر دیتا ہوں۔ اس کا اپنا اسپتال ہے۔ اس اسپتال میں

ہر طرح کی سہولت موجود ہے۔ وہاں پر بابا کا اچھی طرح چیک اپ ہو جائے گا اور بیماری بھی سمجھ میں آجائے گی اور اس طرح سے اچھی طرح علاج ممکن ہو سکے گا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! آپ چٹھی لکھ کر دے دیجیے"..... دلیپ نے کہا تو ڈاکٹر نے اسپتال کے ڈاکٹر کے نام ایک تفصیل سے چٹھی لکھ دی۔ یہ طے کیا گیا کہ شام کو پوشیا کو اسپتال لے جایا جائے گا لیکن جیسے ہی پوشیا کو پتہ چلا کہ اسے چیک اپ کرنے کے لیے اسپتال لے جایا جا رہا ہے وہ چلانے لگا۔

"نہیں میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میرے علاج کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں دو چار دنوں میں اچھا ہو جاؤں گا۔ مجھے اپنا علاج کرنے دو۔ مجھے میری دوا لا کر دو۔"

پوشیا جس دوا کی بات کر رہا تھا اس سے ہر کوئی اچھی طرح واقف تھا، وہ شراب تھی۔

دیسی شراب..........

جو بیمار ہونے کی وجہ سے کئی دنوں سے نہیں مل رہی تھی۔ پہلے شام ہوتے ہی وہ خود دیسی شراب کے اڈے پر جا کر شراب پی کر آتا تھا لیکن کئی دنوں سے وہ پلنگ سے اُٹھ ہی نہیں سکا تھا تو بھلا اڈے پر جا کر شراب کس طرح پیتا۔

گھر کے سارے افراد جانتے تھے کہ پوشیا کی دوا شراب ہی ہے۔ اس سے قبل وہ جب بھی بیمار پڑا کبھی دواخانے نہیں جاتا تھا۔ بیمار ہونے کی صورت میں وہ دہری شراب پینے لگتا اور پتہ نہیں اس شراب میں کیا بات تھی کہ سچ مچ وہ دو تین دنوں میں اچھا ہو جاتا تھا۔ دواخانہ کیا ہوتا ہے؟ دوائیں کیا ہوتی ہیں وہ کس طرح سے کھائی جاتی ہے پوشیا کو معلوم ہی نہیں تھا۔

لیکن گذشتہ کئی دنوں سے وہ کڑوی کسیلی دوا پی رہا تھا اور بدمزہ کڑوی گولیاں کھا رہا تھا۔ اس کے ہڈیوں کی طرح مضبوط جسم میں کئی انجکشن تک چلے گئے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی

تکلیف کم نہیں ہو رہی تھی۔ موہن کے بنگلے کا کام تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اب کلر کا کام باقی تھا۔ دھیرج بھائی نے گرینائٹ اور ماربل کا فرنیچر بنانے کے لیے بالترتیب تین اور ساڑھے چار لاکھ کا بجٹ دیا تھا۔

اس کی بیوی نے ماربل کا فرنیچر بنانا پسند کیا تھا۔ اس لیے دھیرج بھائی کو ۳ لاکھ روپیہ دے دیے گئے تھے اور فرنیچر کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے فرنیچر کے کام کو دیکھ کر دلیپ کو افسوس ہو رہا تھا۔ اس طرح کا کام اس نے کیوں نہیں کرایا۔ دراصل اسے اس طرح کے کام کا علم نہیں تھا۔ اس کے کام کو دیکھ کر سندر نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے بنگلہ میں اسی طرح کا فرنیچر بنائے گا۔

دلیپ بھینس لانے کے لیے گجرات جانے والا تھا لیکن پوشیا کی طبیعت دیکھ کر وہ رک گیا تھا۔ اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھی۔ ۲۰ رمئی کو رجسٹری تھی اور پوشیا کی بیماری؟ اس بارے میں سوچ کر وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ پھر یہ سوچ کر اپنا ذہن جھٹک دیتا تھا کہ ابھی تو ۲۰ رمئی میں دس دن باقی ہیں۔ پوشیا کی بیماری کوئی تشویشناک بیماری نہیں ہے۔ ۲۰ رمئی تک وہ اچھا ہو جائے گا اور اگر بیمار ہی رہا تو اسے جا کر صرف رجسٹری کے کاغذات پر انگوٹھا ہی تو لگانا ہے۔ یہ کوئی مشکل یا ناممکن کام تو نہیں ہے۔ اس لیے اسے گھبرانے اور تشویش میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ہاں گجرات جانے کو اس کا دل نہیں کہہ رہا تھا۔

ادھر ڈاکٹر نے پوشیا کو اسپتال لے جانے کو کہا تھا۔ اس کا بھی ارادہ تھا کہ پوشیا کو اسپتال لے جایا جائے لیکن پوشیا کے انکار پر وہ الجھن میں پڑ گیا تھا۔ شام میں اس نے گھر والوں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا اس پر رکمنی نے اسے سمجھایا۔

''تیرا بابا اسپتال جانے کے لیے نہیں کہہ رہا ہے تو زبردستی اسے اسپتال مت لے جا۔ تو

اسے اچھی طرح جانتا ہے.... زبردستی اسپتال لے جانے پر وہ سارے اسپتال کو گالیوں سے سر پر اٹھالے گا۔ وہ اپنی دوا مانگ رہا ہے تو اسے اس کی دوا دے دو۔ اس سے وہ اچھا ہو جائے گا۔ کئی دنوں سے اسے شراب نہیں ملی ہے نا۔ اس وجہ بھی اس کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔''

اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں سے شراب لاکر پوشیا کو دی۔ دیسی شراب کو دیکھتے ہی اور اس کی بو کو محسوس کرتے ہی پوشیا کا چہرہ چمکنے لگا۔

وہ پلنگ پر اٹھ بیٹھا اور مزے لے کر شراب پینے لگا۔ اس رات پوشیا آرام سے سویا۔

رات بھر کسی نے نہ تو اس کی کھانسی کی آواز سنی اور نہ کراہنے کی۔

سب خوش ہوگئے۔

پوشیا کی اپنی دوا کارآمد ثابت ہوئی ہے۔

سویرے دیر تک وہ سوتا رہا۔ یہ اس کے معمول کے خلاف تھا۔ وہ سویرے جلد اٹھ جاتا تھا۔ بیماری کی حالت میں وہ جلد ہی جاگ جاتا تھا۔ مگر ۹ر بجے تک سویا رہا بھی تو کسی نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

سب سمجھ رہے تھے کہ پوشیا کی بہت دنوں کے بعد شراب ملی تھی۔ اس لیے شاید وہ اس دن مقدار سے زیادہ شراب پی گیا ہے جس کے نشے اور خمار کی وجہ سے اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی ہے۔ ایک دوبار رکمنی نے اس کے جسم کو چھوکر دیکھا تو وہ متفکر ہوگئی۔ اس کا جسم انگاروں کی طرح دہک رہا تھا یعنی اس کا بخار کم نہیں ہوا تھا۔ کھانسی کم ہوگئی تھی یا پھر نشے کے خمار کی وجہ سے کھانسی نہیں آرہی تھی۔

اس نے دوتین بار پوشیا کو آوازیں دیں۔ دوتین بار آوازیں دینے پر بھی پوشیا پر کوئی اثر نہیں ہوا جس کی وجہ سے وہ گھبرا گئی لیکن جب ایک بار آواز دینے پر اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلی تو اس کے دل میں دل آیا۔

اس کا مطلب ہے پوشیا پر غنودگی طاری ہے۔

پوشیا کی یہ غنودگی دو پہر تک دور نہیں ہو سکی تو سارا گھر متفکر ہو گیا اور یہ طے کیا گیا کہ اب پوشیا کو اسپتال لے جانا بہت ضروری ہے۔ اس لیے فوراً بے ہوش پوشیا کو جیپ میں ڈالا گیا اور موہن، سندر اور رکمنی اسے لے کر اسپتال شہر کی طرف چل دیے۔

دلیپ جیپ چلا رہا تھا۔

پوشیا کو اسٹریچر پر لٹا کر اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ڈاکٹر نے اپنے نام کی چٹھی دیکھی... آکر پوشیا کو دیکھا اور بولا... ''میں انھیں ایڈمیٹ کر لیتا ہوں اور ابتدائی علاج شروع کر دیتا ہوں۔ ان کے آٹھ دس ٹسٹ کرنے ہوں گے۔ وہ ٹسٹ بھی شروع کروا دیتا ہوں۔ جب ان ٹیسٹوں کی رپورٹیں آ جائیں گی تو پھر اس کے مطابق علاج شروع کر دوں گا۔''

پوشیا کو ایک اسپتال روم میں ایڈمیٹ کر دیا گیا۔ اس کے جسم سے سرنج لگا دی گئی اور مختلف ٹسٹ کے لیے اس کے جسم سے خون اور دوسری چیزیں نکالی جانے لگی۔ اس کے سینے اور پیٹ کا ایک ایکسرے کرنے کے لیے بے ہوشی کی حالت میں ہی ایکسرے روم لے جایا گیا۔ بے ہوشی کے عالم میں ہی اس کے پورے جسم کی سونوگرافی کی گئی۔ اس کے دلوں کی دھڑکنوں کو ناپنے کے لیے ایک آلہ اس کے جسم سے لگا دیا گیا۔ ایک چھوٹا سا مانیٹر پوشیا کے دل کی دھڑکنیں، نبض کے چلنے کی رفتار اور دوران خون کی رفتار اور دباؤ وغیرہ بتانے لگا۔

شام تک پوشیا کی حالت اس طرح بنا دی گئی جیسے وہ کسی بہت بڑی بیماری کا شکار ہے اور آخری اسٹیج میں ہے۔ پوشیا کو شاید نیند کا انجکشن بھی دے دیا گیا تھا۔ اس وجہ سے اس کی غنودگی کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی گئی۔

سینکڑوں آوازیں دینے اور بری طرح جھنجھوڑنے میں ایک آدھ بار وہ آنکھ کھولتا، ایک لمحہ اپنے چاروں طرف کھڑے چہروں کو دیکھتا اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرتا اور پھر وہ

آنکھیں بند کر لیتا۔

تین دنوں تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ تین دنوں میں اس کے تمام ٹیسٹوں کی رپورٹیں آ گئی تھیں۔ ان رپورٹوں کے آجانے کے بعد ڈاکٹر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پوشیا کو اسپیشل روم سے نکال کر آئی سی یونٹ میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر کے اس رویہ اور پوشیا کی حالت سے سارا گھر پریشان تھا۔ دلیپ نے اس سلسلے میں ڈاکٹر سے بات کرنا بہتر سمجھا اور وہ سیدھا ڈاکٹر کے پاس گیا۔

''مسٹر دلیپ! آپ کے فادر کی ساری رپورٹیں آ گئی ہیں اور ان تمام رپورٹوں کو دیکھنے کے بعد میں خود پریشان ہو گیا ہوں کہ آپ کے فادر کی کس بیماری کا علاج کروں اور کہاں سے شروع کروں۔ انھیں ٹی بی کی شکایت ہے۔ ان کے گردے اچھی طرح کام نہیں کر رہے ہیں۔ شراب پینے کی وجہ سے ان کا لیور پوری طرح خراب ہو گیا ہے۔ بار بار ان کو لو بلڈ پریشر ہو جاتا ہے۔ نبض کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور رکنے لگتی ہے۔ جسم میں بے حد کمزوری ہے ان کے دماغ پر بھی اثر ہوا ہے اور وہ کام کرنا بند کر رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ان کی اس حالت میں اگر فوری طور پر کوئی سدھار نہیں ہوا تو انھیں برین ہیمبرج بھی ہو سکتا ہے اور وہ کوما میں بھی جا سکتے ہیں۔''

پوشیا کی اتنی بیماریوں کے بارے میں سن کر دلیپ گھبرا گیا۔

''میرے والد کو اتنی بیماریاں ہیں ڈاکٹر صاحب.... یہ آپ کہہ رہے ہیں لیکن کچھ دنوں قبل تک تو وہ بھلا چنگا تھا۔''

''برداشت کی قوت مسٹر دلیپ برداشت کی قوت''...ڈاکٹر کہنے لگا ''یہ تمام بیماریاں تمہارے والد کو اچانک نہیں ہوئی ہیں بلکہ عرصہ سے رہی ہوں گی لیکن وہ مضبوط جسم کے مالک ایک کسان ہیں نا اس لیے ان میں تمام بیماریوں اور اس بیماریوں کی تکلیفوں کو برداشت کرنے کی قوت بہت زیادہ ہے۔ اس وجہ سے انھیں نہ تو ان بیماریوں کا پتہ چلا اور نہ آپ لوگوں کو۔''

''ڈاکٹر صاحب! آپ جو بھی چاہے علاج کیجیے۔ ۲۰ رمئی تک میرے والد کو چلنے پھرنے

کے قابل ہونا چاہیے۔ ۲۰رمئی کو ہمارا ایک بے حد اہم کام ہے۔ ہماری زمین کے فروخت کی رجسٹری ہے۔ اگر وہ وقت پر نہیں ہوئی تو میں سخت مصیبت میں آجاؤں گا۔ آپ پیسوں کی کوئی پرواہ مت کیجیے اور ہر طرح کا قیمتی علاج کریں لیکن ۲۰رمئی کو چاہے ایک گھنٹہ کے لیے کیوں نہ ہو میرے والد کو ہوش میں رہنا چاہیے، چلنے پھرنے کے قابل رہنا چاہیے۔''

''ویسے مسٹر دلیپ.... اس وقت آپ کے والد کو جو بیماریاں ہیں اتنی سیریس بھی نہیں ہیں۔ یہ بیماریاں کبھی کو ہوتی ہیں۔ میں اپنا بہترین علاج کر رہا ہوں۔ اس لیے آپ کو پورا یقین دلاتا ہوں کہ ۲۰رتاریخ تک وہ اچھے ہو جائیں گے۔ چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو جائیں گے اور آپ کی رجسٹری میں شاید کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''...... ڈاکٹر نے اسے بھروسہ دلایا۔

''بس ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ سے بس یہی چاہیے۔ مجھے آپ سے بہت امیدیں ہیں اور مجھے پورا اعتماد ہے کہ آپ میرے والد کو ۲۰رمئی سے قبل اچھا کر دیں گے۔'' دلیپ ڈاکٹر سے بولا۔

''میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتماد کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچے۔'' ڈاکٹر نے اطمینان دلایا تو دلیپ اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ دن گذر رہے تھے........

پوشیا بدستور آئی سی یونٹ میں تھا۔ اس کی حالت میں کوئی سدھار نہیں آرہا تھا تو کم سے کم اس بات کا اطمینان ضرور تھا کہ اس کی حالت خراب نہیں ہو رہی ہے تھی۔ دن میں ایک دو بار آوازیں دینے یا جھنجھوڑنے پر وہ آنکھیں کھول دیتا تھا اور اپنے چاروں طرف کھڑے لوگوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگتا۔ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور اس پر غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ دلیپ، موہن اور سندر کا سارا وقت اسپتال میں گزرتا تھا۔ رکمنی بدستور پہلے دن سے اسپتال میں تھی۔ مالتی، وسندھرا اور کلپنا کبھی کبھی پوشیا کو دیکھنے اسپتال میں آجاتی تھی۔ دونوں بیٹیاں بھی آگئی تھیں۔ دونوں داماد بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ رشتہ داروں اور شناساؤں کا تانتا اسپتال میں لگا رہتا

تھا۔ جس کو خبر ملتی کہ پوشیا اسپتال میں ہے وہ اسے دیکھنے کے لیے اسپتال ضرور آتا تھا اور ان لوگوں کو ہر آنے والے کو پوری کہانی سنانی پڑتی تھی۔

دلیپ کے دل کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ اس کا ذہنی تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے ۲۰ر مئی نزدیک آ رہا تھا اس کی راتوں کی نیند حرام ہوتی جا رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھی۔ طرح طرح کے وسوسوں سے اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ ۲۰ر مئی کو اگر رجسٹری نہیں ہوئی تو........

۲۰ر تاریخ کو اگر رجسٹری نہیں ہوئی تو معاہدے کی رو سے ہر دن جب تک رجسٹری نہیں ہو جاتی انھیں امیت شاہ کو ایک لاکھ روپیہ فی دن جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ جب بھی رجسٹری ہوگی شاہ انھیں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ کے طور پر ایک لاکھ روپیہ کم دے گا اور معاہدہ کینسل ہونے کی صورت میں ایک لاکھ روپیہ کی رو سے جرمانہ تو دینا پڑے گا۔ پورے پچاس لاکھ روپیہ فی دن ۳ر فیصدی سود کے ساتھ اسے واپس کرنے پڑیں گے۔

وہ ایسی صورت میں کس طرح شاہ کے پیسے واپس کر پائیں گے؟ اس نے جب معاہدہ پر دستخط کیے تھے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس طرح کے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس سودے کے لیے پوشیا خود راضی تھا۔ اس نے خود زمین فروخت کرنے کے لیے حامی بھری تھی اور اس کی حامی کے بعد انھوں نے زمین کا سودا کیا تھا۔ اس وقت وہ اچھا خاصا تھا۔

اگر پوشیا زمین فروخت کرنے سے انکار کرتا اور اس کو منانے والی بات ہوتی تو وہ کبھی بھی امیت شاہ کی شرط کو قبول نہیں کرتا لیکن ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ۱۹ مئی کو سویرے ہی امیت شاہ کا فون آیا تھا....

''دلیپ بھائی!... ٹھیک تو ہو نا؟...... اس دوران نہ تم نے کوئی فون کیا اور نہ ملنے کے لیے آفس آئے تو میں پریشان ہو گیا کہ کیا بات ہے۔ نہ تو دلیپ بھائی کا فون آ رہا ہے اور نہ وہ ملنے

کے لیے آ رہے ہیں۔ انھیں ۲۰ رمئی کی تاریخ یاد بھی ہے یا نہیں۔"

"یاد ہے امیت بھائی" ....

"تو کل ہمیں رجسٹری کرنی ہے۔ وکیل نے تمام کاغذات تیار کر لیے ہیں۔ آپ ۱۲ ربجے اپنے والد پوشیا کو لے کر رجسٹرار کے آفس پہنچ جایئے۔ میں بھی وہاں موجود رہوں گا۔ بس دس پندرہ منٹ کا کام ہے۔ آپ کے ڈیڑھ کروڑ روپئے بھی تیار ہیں۔"

"جی امیت بھائی! دراصل بات یہ ہے کہ میرے والد اس وقت اسپتال میں ہیں؟"

"اسپتال میں ہیں!" امیت چونک پڑا... "پھر تو وہ رجسٹری کے لیے نہیں آ پائیں گے؟"

"محسوس تو یہی ہو رہا ہے کہ شاید وہ رجسٹرار کے دفتر آنے کے قابل نہ ہوں۔"

"تو اس کا مطلب ہے کل کی رجسٹری کینسل ہو جائے گی۔"

"جی امیت بھائی!"

"کوئی بات نہیں! دو چار دن بعد سہی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جب آپ کے والد ٹھیک ہو جائیں اور رجسٹرار کے آفس آنے کے قابل ہو جائیں تب ہم رجسٹری کریں گے۔"

"جی امیت بھائی۔"

"لیکن دلیپ بھائی! آپ کو ہمارے معاہدے کی شرط یاد ہے نا؟"

"جی امیت بھائی!" دلیپ تھوک نگل کر بولا۔

"جتنے دن لیٹ رجسٹری ہوگی فی دن ایک لاکھ روپیہ کے حساب سے آپ کو پیسے کم ملیں گے۔"

"جی ہاں امیت بھائی! جانتا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے کل نہیں کسی اور دن ٹھیک سہی۔ جب آپ کے والد رجسٹری پر انگوٹھا لگانے کے قابل ہو جائیں سویرے مجھے فون کر دینا۔ اس دن رجسٹری کر لیں گے"..... امیت شاہ نے کہا۔

”جی امیت بھائی!“ دلیپ نے جواب دیا۔ دوسری طرف سے امیت شاہ نے فون بند کر دیا تھا۔

کل ۲۰رمئی ہے۔ کل رجسٹری ہو جانا چاہیے۔ ورنہ ایک لاکھ روپیہ فی دن کے حساب سے تو صاف ہونا شروع ہو جائے گا۔ کل بابا اگر آنکھ بھی کھول دیں تو انھیں اسی حالت میں رجسٹرار کے آفس لے جاؤں گا اور رجسٹری کے کاغذات پر انگوٹھا لگا کر سارے تناؤ سے نجات پا لوں گا۔ اس نے طے کیا تھا لیکن یہ ہو سکے گا بھی یا نہیں...... یا وہ یہ سب کر سکے گا بھی نہیں وہ خود فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

اس ارادے کے باوجود اسے نیند نہیں آسکی۔

وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا اور وہ دن نکلتے ہی ناشتہ کرتے ہی اسپتال کی طرف چل دیا۔ اسپتال پہنچا تو ایک بری خبر اس کی منتظر تھی۔ ڈاکٹر اسے بتا نے لگا...

”رات آپ کے والد کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ میں نے خود چیک کیا تو مجھے یہ دیکھ کر شاک لگا کہ جس بارے میں میں آپ کو کافی پہلے مطلع کر چکا تھا ہمارے اتنے علاج اور احتیاط کے باوجود وہ بات ہوگئی۔“

”کیا بات ہوگئی، ڈاکٹر صاحب؟“ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”آپ کے والد کو ہلکا سا برین ہیمبرج ہو گیا ہے اور وہ کوما میں چلے گئے ہیں اور وہ اس وقت کوما میں ہیں“ .... ڈاکٹر نے بتایا۔

☆☆

○

یہ سنتے ہی دلیپ کے اوپر ایک بجلی سی گری۔ اس نے ڈاکٹر کی اور کوئی بات نہیں سنی۔ فوراً آئی سی یونٹ کی طرف بھاگا۔ آئی سی یونٹ میں پوشیا پر نظر پڑتے ہی اسے اتنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پوشیا کے جسم سے لگی نلکیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک نلی اس کی ناک میں بھی لگی تھی اور قریب آکسیجن کا سلینڈر بھی تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اب پوشیا کو مصنوعی طور پر آکسیجن پہنچائی جا رہی ہے۔

اس کے آس پاس دو تین مانیٹر لگے ہوئے تھے جس پر روشن لکیریں تھرک رہی تھی اور اعداد تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ایک سکون تھا۔ آنکھیں بند تھی لیکن چہرے کے سکون کو دیکھ کر اس کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھی۔ اس سے قبل اس نے پوشیا کے چہرے پر کبھی اس طرح کا سکون نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی تھیں لیکن چہرے پر ایک عجیب سی بے چینی تھرکتی رہتی تھی۔ دکھ درد کے ملے جلے تاثرات ہمیشہ اس کے چہرے پر رقصاں رہتے تھے۔ جو اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہے لیکن وہ کسی طرح اس کی تکلیف کو برداشت کر رہا ہے۔

لیکن اس وقت اس کے چہرے پر چھایا سکون و سکوت دیکھ کر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ پوشیا کو اب کوئی تکلیف نہیں ہے یا پھر اس کا جسم اور ذہن ہر طرح کی تکلیف کے احساس سے آزاد ہوا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے پوشیا کے سینے پر نظر ڈالی۔ سینے سانس کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ سینے کے زیر بم نے اس کے دل کے سارے خدشات دور کر دیے۔

یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ پوشیا ابھی زندہ ہے لیکن کوما میں ہے۔ کوما کی حالت کیا ہوتی ہے اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن پوری طرح اسے اس بارے میں واقفیت نہیں تھی۔ وہ دوڑ کے ڈاکٹر کے پاس گیا......

''ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے میرا بابا کب اچھا ہوگا؟''

''میں کہہ چکا ہوں ان کا ہلکا سا برین ہیمبرج ہوگیا ہے اور وہ اس وقت کوما میں ہیں۔ میں نے ابتدائی علاج شروع کر دیا ہے لیکن ہمارے پاس اس علاج کی بہترین سہولیات نہیں ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ فوراً انھیں ممبئی کے کسی بڑے اسپتال میں لے کر جائیں تو وہاں ان کا بہتر علاج ہوسکتا ہے اور کیونکہ ابتدائی مرحلہ ہے اس لیے وہ جلدی ٹھیک بھی ہوسکتے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! آپ بابا کو ممبئی لے جانے کا انتظام کر دیجیے۔''

''فکر کی کوئی بات نہیں ہے''..... ڈاکٹر بولا ''میں ایک اچھے اسپتال میں فون کر دیتا ہوں۔ وہاں سے ایک ایمبولینس آئے گی، اس میں دو ڈاکٹر اور ایک نرس ہوں گے وہ آپ کے والد کو بنا کسی تکلیف اور خطرے کے اسپتال لے جا کر اسپتال میں بھرتی کر دیں گے۔''

''تو پھر دیر مت کیجیے ڈاکٹر صاحب، فوراً ایمبولینس بلا لیجیے''..... دلیپ جلدی سے بولا۔

''آپ فکر نہ کریں میں بلا لیتا ہوں۔''

''وہاں میرے بابا اچھے تو ہو جائیں گے نا؟''

''ہاں! مجھے پورا یقین ہے وہاں کے بہترین علاج سے تمہارے والد جلد اچھے ہو جائیں گے''، ڈاکٹر نے کہا اور پھر وہ اسپتال کو فون کرنے لگا جہاں پوشیا کو لے جانا تھا۔ دس منٹ تک فون پر بات کرتا رہا پھر دلیپ کی طرف مڑا۔

''آپ فکر مت کیجیے مسٹر دلیپ.... اس مرض کے ماہر ڈاکٹر جوشی سے بات ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ مریض کو بھیج دیا جائے میں سب دیکھ لوں گا۔ اسپتال سے ایمبولینس نکل گئی ہے میں اپنے اسٹاف کو آپ کا ڈسچارج سرٹیفکیٹ اور بل بنانے کے لیے کہہ دیتا ہوں۔''

تھوڑی دیر کے بعد ایک نرس اس کے پاس اسپتال کا بل لے کر آئی۔ وہ لوگ ایک لاکھ روپیہ پہلے ہی ادا کر چکے تھے.... دو لاکھ روپیہ اور ادا کرنا تھا اور ڈاکٹر سے کہلا بھیجا تھا کہ ممبئی کے اسپتال میں دو لاکھ روپیہ ایڈوانس دینے ہوتے ہیں اسی لیے آپ دو لاکھ روپیہ ساتھ لے کر جائیں۔ اس نے گھر موہن کو فون کیا.........

''بابا کو فوراً ممبئی کے اسپتال لے جانا ہے۔ اس کا بل اور ممبئی کے اسپتال میں جمع کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپیہ جمع کرنا ہے۔ اس لیے تم فوراً پانچ لاکھ روپیہ لے کر تم اسپتال پہنچوں۔''

''جی دادا!'' موہن نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ رکمنی کی طرف متوجہ ہوا۔

''ماں یہ سب کیسے ہوگیا؟ کیا یہ سب تمہارے سامنے ہوا؟'' اس نے رکمنی سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا! میں تو آئی سی یونٹ کے باہر سوئی ہوئی تھی۔ اچانک ایک نرس نے آکر مجھے جگا دیا اور کہنے لگی کہ تمہارے مریض کی حالت خراب ہوگئی ہے۔'' آئی سی یونٹ میں نرسوں اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں کی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ مجھے آئی سی یونٹ میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں بڑا ڈاکٹر بھی آ گیا۔ ایک گھنٹے تک وہ سب مل کر آئی سی یونٹ میں پتہ نہیں کیا کیا رہے تھے۔ ایک گھنٹہ بعد وہ ڈکٹر آئی سی یو سے باہر آیا تو میں نے اسے روک کر پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب سب خیریت سے تو ہے نا.........''

''آپ کے پتی کو برین ہیمبرج ہو گیا ہے۔ وہ کوما میں چلے گئے ہیں۔ ہم نے ابتدائی علاج شروع کردیا ہے۔ آپ سویرے انھیں دیکھ سکیں گے....''

''میں نے دانستہ تم لوگوں کو خبر نہیں کی کہ تم اس خبر کو سن کر گھبرا نہ جاؤ'' رکمنی بتانے لگی۔

یہ سن کر دلیپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔

دلیپ روپیہ لے کر آ گیا تھا۔

اس نے اسپتال کا بل ادا کیا۔

ممبئ کے اسپتال کی ایمبولینس بھی آ گئی تھی۔ سچ مچ اس کے ساتھ دو ڈاکٹر اور ایک نرس تھے۔ انھوں نے بڑے احتیاط سے پوشیا کو آئی سی یونٹ سے نکالا اور ایمبولینس میں جا کر لٹایا اور اس کے جسم کے ساتھ وہ تمام نلیاں اور مانیٹر لگا دیئے جو آئی سی یونٹ میں اس کے جسم کے ساتھ لگے تھے۔ اس مصنوعی سانس کا آلہ بھی لگا دیا گیا۔ ایک گھنٹہ کے اندر وہ ممبئ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس کے ساتھ موہن، سندر اور رکمنی تھے۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں ممبئ کے اسپتال میں پہونچے تھے۔

فوراً پوشیا کو اس اسپتال کے آئی سی یونٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں پر ڈاکٹر جوشی دیگر دو چار ڈاکٹروں کے ساتھ پہلے سے تیار تھا۔ انھوں نے اپنی کاروائی علاج شروع کر دیا۔ آئی سی یونٹ میں انھیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر جوشی آئی سی یونٹ کے باہر آیا تو اس نے اس سے بات چیت کی۔

''ہاں تو مسٹر دلیپ! آپ مریض کے بڑے لڑکے ہیں نا۔''

''ہاں ڈاکٹر صاحب''....اس نے جواب دیا۔

''فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے علاج شروع کر دیا ہے۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ آپ جلد یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی وجہ سے جلدی علاج شروع ہو گیا اور ہمارے لیے بھی

سانی ہوگئی۔ ابتدائی علاج کارگر ثابت ہوتا ہے اور ہمارے ابتدائی علاج کی نشانیاں بھی دکھائی دینے لگی ہے۔ جس سے یہ امید بندھی ہے کہ دو چار دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میرا ابا ٹھیک تو ہو جائے گا نا۔''

''ہاں ہاں! ٹھیک تو ہو جائے گا۔''

''کتنے دن لگیں گے؟''

''دیکھو مسٹر دلیپ! تمہارا ابا کوما میں ہے اور کوما سے مریض اتنی جلدی نہیں نکلتے ہیں۔ ایک دن بھی لگ سکتا ہے ایک ہفتہ، ایک مہینہ اور ایک سال بھی لیکن فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے بروقت علاج سے تمہارے بابا جلد کوما سے باہر نکل آئیں گے۔''

''بھگوان آپ کی زبان مبارک کرے، ڈاکٹر صاحب''.....، دلیپ نے کہا۔

موہن نے دو لاکھ روپے اسپتال کے کاؤنٹر پر جمع کر دیے تھے۔ اس کی رسید اس نے دلیپ کی طرف بڑھا دی جو اس نے رکمنی کو دے دی۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ اسے سنبھال کر رکھے۔

تھوڑی دیر بعد نرس دواؤں کی ایک لمبی چوڑی فہرست لے کر آئی۔ تمہارے مریض کے علاج کے لیے اسپتال کے اسٹور سے یہ تمام دوائیں فوری طور پر استعمال کر دی گئی ہیں۔ یہ تمام دوائیں نیچے کے میڈیکل اسٹور سے لاکر ہمارے اسٹور میں جمع کرا دیں۔ موہن چپ چاپ دواؤں کی چٹھی لی اور اسے لے کر نیچے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں دواؤں اور انجکشن سے بھری دو کیری بیگ تھے۔

''اسٹور کہاں ہے....؟'' اس نے نرس سے پوچھا۔

''کوئی بات نہیں ہے۔ آپ میرے پاس دے دیجیے میں انھیں اسٹور میں دے دوں گی''، کہتے ہوئے اس نے دواؤں کے کیری بیگ موہن کے ہاتھ سے لے لیے۔ ۴۵/ ہزار روپیہ کا

بل ہوا ہے۔ موہن نے کہا تو اس کا سر چکرانے لگا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ چار پانچ دن گذر گئے.....

روزانہ تیس چالیس ہزار روپیوں کی دوائیاں اور انجکشن پوشیا کو لگائے جاتے۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ پوشیا کی طبعیت میں سدھار آ رہا ہے لیکن دلیپ کو اس میں کچھ بھی سدھار محسوس نہیں ہوتا تھا۔

یہاں چالیس پچاس ہزار روپیہ خرچ ہو رہا تھا۔ ادھر امیت شاہ کا ایک لاکھ روپیہ فی دن کے حساب سے جرمانہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتے تو اپنی بیوقوفی پر غصہ آتا تھا کہ اس نے ایسا معاہدہ ہی کیوں کیا ؟

وہ زمین بیچنے کے لیے تیار تھا۔ پوشیا رجسٹری کر کے دینے کو تیار تھا۔ رجسٹری کے لیے ایک ماہ کی مدت امیت شاہ نے ہی مانگی تھی ۔ اس وقت اسے اعتراض کرنا چاہیے تھا۔ امیت شاہ ایک ماہ بعد روپیہ دے گا۔ امیت شاہ کو اس تاخیر کا جرمانہ دینا چاہیے تھا۔

اسے لگ رہا تھا جیسے عیار مکار امیت شاہ نے اسے بڑی عیاری سے اس جال میں پھنسایا تھا لیکن پوشیا کے ساتھ ایسا ہوگا کیا امیت شاہ کو معلوم تھا؟ امیت شاہ کو کہاں سے معلوم ہوتا جب ان کو خود وہم وگمان نہیں تھا تو بھلا امیت شاہ کو کہاں سے معلوم ہوتا۔ اس کی سمجھ میں امیت شاہ کا یہ گورکھ دھندہ نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے پیچھے اس کا جو بھی مقصد رہا ہو تقدیر نے اسے اپنے مقصد میں کامیاب کیا تھا۔

اس کے دو دنوں کے بعد یہ تبدیلی ضرور نمودار ہوئی کے ہمیشہ سپاٹ رہنے والا پوشیا کے چہرے پر کبھی کبھی لکیریں ابھرنے لگیں۔ اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات اس بات کا ثبوت تھے کہ اب اس کا جسم اور اس کا احساس کام کرنے لگا ہے تبھی تو اس کے چہرے پر تاثرات ابھرنے لگے ہیں۔ ورنہ پہلے تو اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہتا تھا۔ اس کو کیا تکلیف ہے؟ اسے تکلیف

ہے بھی یا نہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

اس درمیان ایک بار امیت شاہ کا فون آیا تھا تو اس نے امیت شاہ کو بتا دیا کہ اس کے پتا جی کو اسے ممبئی کے ایک بڑے اسپتال میں منتقل کرنا پڑا ہے۔

''اوگاڈ'' یہ سن کر امیت شاہ نے کہا تھا.... ''ٹھیک ہے دلیپ بھائی میں آپ کے پتا جی کے اچھے ہو جانے تک انتظار کرلوں گا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا تم کو جلدی کہاں سے ہوگی، تم تو چاہو گے کہ اور بھی کچھ دنوں تک معاملہ ٹل جائے۔ پوشیا کی بیماری بڑھتی جائے تا کہ اس کے لاکھ روپیہ عوض کے جرمانہ کا منافع جاری رہے۔

وہ حساب لگاتا کہ اگر پوشیا اس طرح دو مہینے اسپتال میں رہا تو اس کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں آئے گا اور بھگوان نہ کرے پوشیا کا کچھ ہو گیا تو پھر وہ زمین کے رجسٹری کر نہیں پائے گا۔ زمین اپنے نام پر کروانے میں مہینوں لگ جائیں گے اور رجسٹری کروانے کے بعد تو امیت شاہ اسے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دے گا بلکہ اس کے جرمانے کے طور پر اس سے اور پیسہ وصول کرے گا۔

اس خیال کے آتے ہی اس کو پسینہ چھوٹنے لگتا۔ اس نے اس سلسلے میں موہن اور سندر سے بات کی تھی۔ سب کا خیال تھا کہ اس طرح تو وہ خطرے میں گھرے ہیں۔ ان کے اوپر ایک خطرے کی تلوار لٹک رہی ہے جو کبھی بھی گر کر ان کے وجود کو فنا کر سکتی ہے۔

سب کا یہی کہنا تھا کہ رجسٹری جلد از جلد ہو جانا چاہیے تا کہ انھیں یہ روز کے نقصان سے نجات مل سکے لیکن یہاں پوشیا کی حالت ایسی تھی کہ اس کے جسم سے کئی نلیاں لگی تھیں اور کئی مانیٹر اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ یہ طے کیا گیا کہ پوشیا کی حالت تھوڑی بھی سدھرے.... اگر وہ آنکھ بھی کھولنے لگے تو بھی اسے فوراً اسپتال سے ڈسچارج کر کے رجسٹری کر لی جائے۔ رجسٹری کے بعد

دوبارہ ضرورت پڑی تو وہ پوشیا کو اسپتال میں داخل کر دیں گے۔ دلیپ روزانہ ڈاکٹر جوشی سے بات کرتا تھا۔ جوشی روزانہ اسے جھوٹی امید دلاتا تھا۔

''تمہارے پتاجی کی حالت سدھر رہی ہے۔ اندرونی طور پر وہ Recover ہو چکا ہے ۔شاید چار پانچ دنوں میں آنکھ کھول دے۔ پہلی بار میں دیکھ رہا ہوں کہ برین ہیمبرج کا کیس اتنی جلدی Recover ہو رہا ہے ورنہ اسے نارمل ہونے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔''

پتہ نہیں یہ ڈاکٹر کی جھوٹی تسلی تھی یا اصلیت............

اسے اس سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں صرف ایک ہی بات تھی۔ پوشیا آنکھ کھول دے۔ اگر پوشیا کی آنکھ کھل جاتی ہے تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہوگی اور اس کو سارے مسائل اور تناؤ سے نجات مل جائے گی۔

اگلے دن جب وہ اسپتال پہنچا تو رکمنی نے اسے یہ خوشخبری دی کہ اب بابا کے منہ سے ہلکی ہلکی آواز اور کراہ نکلنے لگی ہے۔ یہ سنتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ عرصے سے پوشیا کے منہ سے آواز یا کراہ نہیں نکلی تھی۔ اب کراہ یا آواز نکلنے کا مطلب صاف ظاہر کہ اب اس کی حسیں اچھی طرح کام کرنے لگی ہیں۔

وہ سیدھا آئی سی یونٹ میں جا کر پوشیا کے بیڈ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ پوشیا کا چہرہ سپاٹ تھا۔ پوشیا کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ اس نے اپنی نظر پوشیا کے چہرے پر جمائے رکھیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا لیکن پوشیا کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

اچانک اندھیرے میں امید کی ایک کرن ابھری۔ پوشیا کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھرے تھے اور اس کے تمام خدشات اور وسوسے دور ہو گئے تھے۔

پوشیا کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اس بات کا ثبوت تھے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے جیسا وہ سوچ رہا ہے اور پھر اس کا دل اچانک خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے کانوں سے پوشیا کے ہونٹوں سے نکلنے والی نحیف کراہ کی آواز ٹکرائی تھی۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

اب کچھ بھی نہیں تھا جس نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ پوشیا کی حالت میں تیزی سے سدھار آ رہا تھا اور بھگوان نے چاہا تو وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اسے سارے خدشات ،تناؤ اور فکروں سے نجات مل جائے گی۔ دس منٹ......... صرف دس منٹ کی بات ہے۔

اگر دس منٹ کے لیے بھی پوشیا ہوش میں آئے اور آنکھ کھول دے تو اسے ساری فکروں سے نجات مل سکتی ہے۔ اس کے سارے خدشات دور ہو سکتے ہیں۔ اسے روزانہ ہونے والے ایک لاکھ روپیہ کے نقصان سے نجات مل سکتی ہے اور اس کے پاس ڈیڑھ کروڑ روپیہ نقد آ سکتا ہے اور سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن شرط صرف یہ تھی کہ پوشیا کے جسم سے لگی یہ نلکیاں نکل جائیں اور پوشیا آنکھ کھولنے لگے۔

اس کا دل واپس گھر جانے کو نہیں کہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ رات دن پوشیا کے سرہانے بیٹھے رہے اور مشاہدہ کرے کہ وہ اس قابل ہو رہا ہے یا نہیں کہ وہ اپنا رجسٹری کا کام کر سکے لیکن اسے محسوس ہوتا پوشیا کے پاس رہنا اس کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی ماں اور دوسرے بھائیوں کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہے کہ پوشیا کی بیماری کی وجہ سے جو رجسٹری لیٹ ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ان کا کتنا نقصان ہو رہا ہے اور اگر کسی وجہ سے وہ رجسٹری نہیں ہو سکی تو ان کا کتنا بڑا نقصان ہوگا۔ شاید وہ اس بارے میں کبھی سوچتے بھی نہیں ہوں گے۔ ایک وہی ہے جو اس بارے میں رات دن سوچتا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے تناؤ کا شکار رہتا ہے۔

لمحہ بہ لمحہ بدلتے حالات اور پوشیا کی حالت کے ساتھ اس کے دل کی ڈھڑکنیں تیز اور کم ہو جاتی ہے۔ اگر وہ کچھ دن اور اسی عذاب میں مبتلا رہا تو اسے بھی پوشیا کی طرح اسپتال میں داخل

کرنا پڑے گا۔

پوشیا کے پاس وہ آدھے گھنٹہ بھی رہتا تو اسے اتنے امتحانوں سے گزرنا پڑتا کہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا اور اس وقت بھی پوشیا کے پاس نہیں آتا جب اس کا پوشیا کے پاس رہنا ضروری ہوتا تھا یا اسے ڈاکٹر بلاتا تھا۔

تو بھلا وہ کس طرح پوشیا کے پاس رہ سکتا تھا۔ اس کی ماں مضبوط دل گردے کی مالک تھی۔ اس نے زندگی بھر پوشیا کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے وہ پوشیا کے پاس ڈٹی ہوئی تھی۔ سندر اور موہن کو اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ پوشیا کی حالت کیسی ہے۔ وہ زندہ رہے گا بھی یا نہیں؟ ان کے لیے پوشیا کا زندہ رہنا کتنا ضروری ہے؟ وہ بیٹے ہونے کا صرف فرض نبھار ہے تھے۔

ایک دو دن میں اسپتال آجاتے اور ایک آدھ گھنٹہ پوشیا کے پاس بیٹھ کر ممبئی کی سیر اور خریداری کے لیے نکل جاتے تھے۔ ان کی ان حرکتوں پر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ انھیں ٹوکے لیکن وہ انھیں ٹوک کر ایک نیا تناؤ پالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے ان کی ساری باتیں نظر انداز کر رہا تھا۔

○

پوشیا کو اسپتال میں داخل کیے دس دن ہو گئے تھے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا جا رہا تھا۔ طرح طرح کے قیمتی ٹسٹ کیے جا رہے تھے جن کا بل ہزاروں روپیہ ہوتا۔ مہنگی مہنگی دوائیں اسے دی جاتی ۔ بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کو بلا کر پوشیا کو بتایا جاتا۔

کئی ڈاکٹر آئے تھے انھوں نے پوشیا کا اچھی طرح معائنہ کیا تھا۔ دیگر ڈاکٹروں کے ساتھ ان کی میٹنگیں ہوتی تھیں اور پھر سب کے مشوروں سے پوشیا کا علاج شروع ہوا تھا۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ کوما میں گئے انسانوں کے بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنے دنوں میں کوما سے نکلے گا۔ اسے ایک دن بھی لگ سکتا ہے، ایک ہفتہ بھی ، ایک مہینہ بھی اور ایک سال بھی یا پھر شاید وہ موت تک کوما میں رہے۔ لیکن پوشیا کے بارے یہ امید ہے کہ وہ جلد کوما سے باہر آجائے گا کیونکہ اس کا ہیمبرج معمولی ہے اور اس کا بروقت علاج شروع کر دیا گیا ہے۔

لیکن نو دنوں کے بعد بھی اس کی حالت میں کوئی خاص سدھار نہیں آ سکا۔ دلیپ جو چاہتا تھا وہ نہیں ہو رہا تھا۔ پوشیا آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ چہرے پر احساس کے تاثرات ابھر رہے تھے کبھی کبھی اس کے منہ سے آہ بھی نکل جاتی تھی لیکن اس کی آنکھ نہیں کھل رہی تھی ۔ وہ آنکھ کھول کر کچھ نہیں

دیکھ رہا تھا۔

اگر وہ صرف آنکھ کھولے اور آنکھ کھول کر آس پاس کے لوگوں، چیزوں کو دیکھ لے تو دلیپ کا منشا پورا ہو جاتا۔ اس کے بعد دلیپ کو جو کرنا تھا اس کی وہ بہت پہلے تیاری کر چکا تھا۔ ایک لاکھ روپیہ روز کے حساب سے امیت شاہ کا جرمانہ چل رہا تھا اور اسپتال کا بل بھی کچھ اسی رفتار سے چل رہا تھا۔ وہ اس دوران دو بار تین تین لاکھ روپیہ لاکر جمع کر چکے تھے اور دوائیوں کا بل بھی لاکھوں میں ہو گیا تھا۔ ایک ایسا تناؤ دلیپ کو گھیرے ہوئے تھا جس کی وجہ سے اس کو راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔

وہ رات بھر بستر پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہتا۔ سویرا ہوتے ہی تیار ہو کر اسپتال کے لیے نکل جاتا۔ دن بھر اسپتال میں تو کبھی پوشیا کے پلنگ کے سرہانے اس امید میں بیٹھا رہتا کہ کبھی تو پوشیا آنکھ کھولے اور اس کی امید بر آئے۔

لیکن امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کے دونوں بھائیوں اور ماں کو اس کے تناؤ سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ ایک بیوی اور بیٹوں کا فرض ادا کر رہے تھے لیکن دلیپ کے کاندھے پر اتنی بڑی ذمہ داری تھی کہ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر ہی اس کی روح فنا ہونے لگتی تھی۔ ہر روز وہ ایک امید کے ساتھ اسپتال آتا تھا کہ آج شاید پوشیا آنکھ کھول دے۔ ڈاکٹر تو روزانہ اسے اطمینان دلاتے ہیں کہ پوشیا جلد آنکھ کھول دے گا۔ وہ بہتر سے بہتر اس کا علاج کر رہے ہیں لیکن اس کی آس پوری نہیں ہوتی تھی۔

اس دن جب وہ اسپتال سے گھر کے لیے نکلا تھا تو اس کے دل میں کوئی آس نہیں تھی۔ مایوسیوں کے گہرے اندھیرے نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اس دن اس نے اپنے دل کو اس کے لیے تیار بھی کر لی تھا کہ آج بھی کوئی اہم بات نہیں ہے۔ جس طرح نو دن گذر گئے اسی طرح آج کا دن بھی گزر جائے گا۔ اس لیے کسی خوش فہمی میں مبتلا بھی نہیں تھا۔

روز کی طرح حاضری لگانے کے لیے اسپتال جا رہا تھا لیکن اس دن ایسی خوشخبری اس کی منتظر تھی جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جب وہ اسپتال پہنچا تو رکمنی بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی.... اسے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ فرطِ جذبات سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

''کیا بات ہے ماں کچھ کہنا چاہتی ہو؟ بڑی بے چین دکھائی دے رہی ہو؟'' رکمنی کی حالت دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''دلیا....... چمتکار گھڑلا'' (دلیپ چمتکار ہو گیا) رکمنی خوشی سے جھومتی ہوئی بولی...'' رات میں بابا نے آنکھ کھولی تھی۔''

''کیا''....

یہ سنتے ہی اس کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا اور اس کے سارے وجود میں مسرت کی رنگیں سرایت کر گئیں۔

''ہاں! بابا نے رات میں دوبار آنکھیں کھولی تھی۔ آنکھ کھولی..... آس پاس دیکھا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں''..... رکمنی بولی۔

اس نے اس سے آگے رکمنی کی کوئی بات نہیں سنی۔ دوڑتا ہوا آئی سی یونٹ میں پوشیا کے پاس گیا اور اسے آوازیں دینے لگا۔

''بابا....... بابا....... آنکھیں کھولو....... دیکھو میں آیا ہوں۔ تمہارا دلیا!''..... لیکن پوشیا کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔

ایک دوبار پھر مایوسی کے گہرے اندھیرے چاروں طرف سے اسے گھیرنے لگے۔ اچانک پوشیا کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی کراہ نکلی اور اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پوشیا کی آنکھیں کھلی تھی اور وہ خالی خالی نظروں سے اسپتال

کی چھت کو تاک رہا تھا۔

''بابا...... بابا..... میں ..... میں دلیپ .. دلیا....'' اس نے پوشیا کو آوازیں دیں لیکن پوشیا کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ پھر پوشیا نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لی۔

پوشیا نے اس کی آوازوں پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا، دلیپ کو اس بات کو قطعی کوئی دکھ نہیں تھا لیکن پوشیا نے آنکھ کھولی تھی اس کے لیے یہ سب سے بڑی بات تھی۔ وہ پوشیا کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پوشیا کو آوازیں دیتا۔ دو گھنٹہ میں تین بار ایسا ہوا تھا کہ اس کی آوازوں کو سن کر پوشیا نے آنکھیں کھولی تھی۔ ایک بار اس کی طرف مڑ کر بھی دیکھا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ کہیں بھی شناسائی کی جھلک نہیں تھی۔

لیکن دلیپ کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ خوشی سے جھوم رہا تھا۔ اسے اپنا مقصد کافی قریب محسوس ہو رہا تھا۔ دوپہر تک پوشیا کی حالت میں کافی سدھار پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ آوزیں دینے پر آنکھ کھول دیتا تھا۔ کچھ دیر خالی نظروں سے سامنے دیکھتا رہتا اور پھر آنکھ بند کر لیتا تھا۔

اسی وقت دلیپ نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اس نے ڈاکٹر نے کہا وہ پوشیا کو گھر لے جانا چاہتا ہے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔

''نہیں .... ہم مریض کو چھوڑ نہیں سکتے۔ ابھی اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے ڈسچارج کیا جائے۔ اس کا علاج جاری ہے۔ وہ کوما میں ہے اس حالت میں نہیں ہے کہ اسے گھر لے جایا جا سکے۔ بلکہ ہمیں تو ڈر ہے کہ اسے آئی سی یونٹ کے باہر بھی نکالا گیا تو اس کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس کی زندگی کی ذمہ داری کون لے گا؟''

''میں اس کا بیٹا ہوں..... اس کی زندگی کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ اگر پوشیا کو یہاں سے لے جانے پر کچھ بھی ہوتا ہے تو اس کی ساری ذمہ داری میری ہو گی۔'' دلیپ نے صاف

صاف کہہ دیا۔

''نہیں! ہم پوشیا کو اس حالت میں اسپتال سے ڈسچارج نہیں کر سکتے'' ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا۔

''تو ٹھیک ہے۔ جب تک پوشیا اچھا نہ ہو جائے اس کو اسپتال میں رکھیے اور یہ کان کھول کر سن لیجیے... اب میرے پاس اس کے علاج کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ میں لاکھوں روپیہ اس کے علاج پر خرچ کر چکا ہوں اور آج کے بعد جتنے دن میرا بابا اس اسپتال میں رہے گا میں نا تو اسپتال کا بل دوں گا اور نہ دوائیوں کا۔''

دلیپ کی بات سن کر ڈاکٹر کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثر ابھر آئے۔ یہ کہہ کر دلیپ پوشیا کے پاس آ گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ایک نرس دلیپ کے پاس آئی اور اس نے کچھ کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔

یہ مریض کے ڈسچارج کا سرٹیفکٹ ہے۔ یہ اس بات کا اقرار نامہ ہے کہ آپ اپنی مرضی اور ذمہ داری پر مریض کو اسپتال سے لے جا رہے ہیں۔ اگر اس کو کچھ ہو جاتا ہے تو اس کے لیے اسپتال ذمہ دار نہیں ہے اور یہ ہے اسپتال کا آج تک کا بل۔ ابھی مریض کو ڈسچارج کرانے کے لیے ایک لاکھ روپیہ بل اور ادا کرنا پڑے گا۔

''سب مل جائے گا''.... کہتے ہوئے اس نے اقرار نامے پر دستخط کر دیے اور موہن کو فون لگانے لگا۔

''ہاں بولو دادا'' ....

''تم فوراً سندر کے ساتھ دو لاکھ روپیہ اور جیپ لے کر اسپتال لے کر آؤ۔ ہم بابا کو اسپتال سے ڈسچارج کر کے گھر لا رہے ہیں۔''

''جی دادا!''.... موہن نے جواب دیا تو اس نے فون بند کر دیا۔ ☆☆

○

سار ی تیاریاں ہو گئی تھیں۔

موہن اور سندر جیپ اور دو لاکھ روپیہ لے کر آئے تھے۔ ایک لاکھ روپیہ اسپتال کا بل ادا کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نے پوشیا کو آئی سی یونٹ سے نکال کر اسٹریچر پر ڈال کر ان کے حوالے کر دیا۔ وہ خود ہی اسٹریچر لے کر لفٹ کے ذریعے نیچے آئے جہاں ان کی جیپ کھڑی تھی۔ پوشیا کو درمیان میں لمبی سیٹ پر لٹا دیا گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھی۔

لیکن اسے اٹھانے اور لٹانے میں جو حرکت ہوتی تھی اس کی وجہ سے کبھی کبھی اس کے جسم میں جنبش ہوئی تھی اور پوشیا کے چہرے پر کرب کے تاثرات بھی ابھرتے تھے اور کبھی کبھی اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ بھی نکل جاتی تھی۔ موہن نے پوشیا کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور رکمنی اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔ سندر آگے بیٹھا تھا۔ پوشیا سوکھ کر کانٹا اور گٹھری ہو گیا تھا۔

وہ موہن کی گود میں سر رکھ لیتا تھا اور اس کے پیر رکمنی کی گود میں تھے۔ موہن کبھی کبھی پیار سے پوشیا کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگتا تو رکمنی اس کے پیر دبانے لگتی۔ دلیپ جیپ لے کر اسپتال سے چل دیا۔

کسی نے دلیپ سے کوئی بات نہیں پوچھی۔

کسی نے پوچھنے کی ہمت بھی نہیں کی کہ اس نے پوشیا کو اسپتال سے کیوں ڈسچارج کیا ہے۔

وہ آئی سی یونٹ میں تھا......

ابھی وہ نارمل نہیں ہوا ہے۔ اس طرح اس کی جان کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کی خاموشی جیسے یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ سب جیسے ان کا بھی منشا ہے۔ دلیپ نے جو کیا وہ بھی یہی چاہتے ہیں۔ دلیپ نے جو کچھ کیا ہوگا ان کے بھلے کے لیے ہی کیا ہوگا۔

اس وجہ سے کسی نے اپنے لب بھی نہیں کھولے اور چپ چاپ دلیپ کا ساتھ دیتے رہے۔ ہمیں آج ہر حال میں رجسٹری کرانی ہے۔ ممبئی شہر سے جب وہ باہر آئے تو دلیپ کہنے لگا۔ ہمارا روزانہ ایک لاکھ روپیہ کا نقصان ہو رہا ہے اور اگر بابا کو کچھ ہو گیا تو ہم بھکاری ہو جائیں گے۔ کہیں کے نہیں رہیں گے۔

دلیپ کی اس بات کو سن کر بھی کوئی کچھ نہیں بولا۔

''ہم شام سات بجے تک رجسٹرار آفس پہنچ جائیں گے۔ میں نے سب سیٹنگ کر لی ہے۔ شام سات بجے تک صرف اور صرف ہمارے لیے رجسٹرار آفس کھلا رہے گا اور وہاں امیت شاہ رجسٹری کے کاغذات اور وکیل کے ساتھ موجود ہوگا۔''

دلیپ نے کہا لیکن اس بار بھی کسی نے اس کی کسی بات پر لب نہیں کھولا۔ چپ چاپ دلیپ کی باتیں سنتے رہے۔ بابا آواز دینے پر آنکھیں کھول دیتا ہے۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ رجسٹرار کو اس حالت میں رجسٹری کرنے کی قیمت دی جا چکی ہے اور پورے اسٹاف کو بھی۔ اس لیے آج ہر حال میں رجسٹری ہو جائے گی۔ رجسٹری کے کاغذات پر بابا کا انگوٹھا لگ جائے تو میں سارے تناؤ اور الجھنوں سے نجات پا لوں گا۔

اس کے بعد پھر ایک خاموشی چھا گئی۔

جیپ شہر کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔ دلیپ دانستہ جیپ دھیرے دھیرے چلا رہا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسے ٹھیک سات بجے شہر اور رجسٹرار آفس پہنچنا ہے۔ جلد پہنچ کر وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

جلد پہنچ جاتا تو اس وقت رجسٹرار کے آفس میں ایک دو آدمی بھی رہے تو ان کا کام بگڑ سکتا ہے۔ وہ سارا منظر، تماشہ دیکھیں گے اور اس بات کو سارے شہر میں پھیلا دیں گے کہ کس حالت میں آج رجسٹری ہوئی ہے۔ اس نے دانستہ سات بجے کا وقت لیا تھا.........تا کہ کسی کے وہم میں بھی نہ ہو کے اس وقت رجسٹرار کا آفس کھلا ہوگا اور وہ اپنی مرضی سے بنا روک ٹوک کے رجسٹری کریں گے۔ جیسے ہی محسوس ہوا کہ بابا دو تین بار آوازیں دینے پر آنکھیں کھولتا ہے سارا منصوبہ اس کے ذہن میں آ گیا تھا۔

اس نے امیت شاہ سے بات کی تھی کہ آج رجسٹری کرنی ہے اور کس حالت میں کرنی ہے۔ امیت شاہ اور رجسٹرار کے بہت زیادہ قریبی تعلقات تھے کیونکہ امیت شاہ کی ہر ہفتہ ایک دو رجسٹریاں اس آفس میں رہتی ہے۔ اس نے رجسٹرار سے بات بھی کر لی اور اس کام کے لیے رجسٹرار اور آفس کے لوگوں کی قیمت بھی پوچھ لی۔ رجسٹرار اور آفس کا عملہ ایک لاکھ روپئے میں یہ کام کرنے کو تیار ہوا تھا۔

دلیپ نے فوراً ایک لاکھ روپیہ دینے کی حامی بھر لی اور امیت شاہ سے کہہ دیا کہ وہ ہر حال میں سات بجے شام تک بابا کو لے رجسٹرار آفس پہنچ رہا ہے۔ رجسٹری کی مقررہ تاریخ سے دس دن زیادہ ہو گئے تھے۔ اس طرح امیت شاہ دس لاکھ روپیہ کما چکا تھا۔ وہ رجسٹری کو ٹال کر زیادہ بھی کما سکتا تھا لیکن اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھی۔ اس نے سوچا پوشیا اسپتال میں ہے۔ اگر وہ مر جاتا ہے تو پھر اس کی رجسٹری کبھی نہیں ہو پائے گی۔ نہ زمین اس کے ہاتھ آ سکے گی اور نہ جرمانے کے پیسے بلکہ دلیپ اور اس کے بھائیوں سے اپنے پیشگی دیئے پچاس لاکھ وصول

کرنے بھی مشکل ہو جائیں گے۔ اس لیے اس نے سارے انتظام کر لیے۔

دلیپ نے ڈاکٹر سے بات کی اور ڈاکٹر کے انکار پر اس نے بل نہ دینے کی بات کی جس کو سن کر اسپتال والوں نے فوراً پوشیا کو ڈسچارج کر دیا۔ اس طرح سب کچھ اس کے منصوبے کے مطابق ہو گیا تھا۔

اب صرف اور صرف ایک اور آخری مرحلہ رہ گیا تھا۔

شام ہو گئی تھی.......... چاروں طرف گھنا اندھیرا چھا گیا تھا۔

سڑکوں کے اسٹریٹ لائٹ روشن ہو گئے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک بڑھ گئی تھی۔ ٹریفک کی وجہ سے کئی بار ان کی جیپ ٹریفک میں پھنسی اور کہیں کہیں تو دس قدم کا فاصلہ طے کرنے میں انھیں پندرہ بیس منٹ لگ گئے لیکن دلیپ مطمئن تھا۔

ابھی سات نہیں بجے تھے۔ اسے سات بجے رجسٹرار کے آفس پہنچنا تھا اور اسے پورا اعتماد تھا کہ وہ سات بجے تک رجسٹرار کے آفس پہنچ جائیں گے۔ اس درمیان امیت شاہ کا فون آیا تھا۔

''دلیپ بھائی کہاں تک پہنچے؟''

جواب میں دلیپ نے اس جگہ کا نام بتایا جہاں پر اس وقت کی جیپ ٹریفک میں پھنسی تھی۔ میں وکیل کے ساتھ رجسٹرار کے آفس پہنچ رہا ہوں۔

''رجسٹرار صاحب اور ان کے آفس کا تمام عملہ رکا ہے۔ تم ہر حال میں سات بجے آفس پہنچ جاؤ۔''

''آپ فکر مت کیجیے، امیت بھائی۔ میں سات بجے آفس پہنچ ہی جاؤں گا، دلیپ نے جواب دیا اور وہ سچ مچ سات بجے رجسٹرار کے آفس میں پہنچ گیا تھا۔

پوشیا کو گود میں اٹھا کر موہن کے جیپ سے باہر نکالا اور اسے کاندھے پر لاد کر رجسٹرار آفس کی طرف بڑھا۔ رجسٹرار آفس میں پہنچ کر اس نے پوشیا کو اس کرسی پر بٹھا دیا جس کرسی پر بٹھا

کر فوٹو نکالا جاتا ہے۔ پوشیا کو اچھی طرح کرسی پر بٹھا کر کیمرے کا اینگل درست کیا گیا تاکہ پوشیا کی تصویر صاف آسکے۔

پوشیا آنکھ بند کیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ دلیپ پوشیا کو آوازیں دینے لگا۔

''بابا.........بابا.........میں دلیپ.........آنکھیں کھولو........''

اچانک پوشیا نے آنکھیں کھول دی۔ پوشیا کے آنکھ کھولتے ہی ان کے دل خوشی سے دھڑک اٹھے۔ کیمرہ تیار تھا.....آپریٹر نے فوراً کیمرے کا بٹن دبا دیا۔ کمپیوٹر میں پوشیا کا فوٹو محفوظ ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھی۔

تھوڑی دیر بعد پوشیا نے آنکھیں بند کرلیں۔ رجسٹرار کے کلرک نے اپنے ہاتھوں سے پوشیا کے ہاتھ سیاہی میں بھگو کر رجسٹری کے کاغذات پر لگائے۔ اس کے انگوٹھے کے نشانات اسکین کیے گئے۔ اس کے بعد امیت شاہ کی تصویر لی گئی تھی۔ رجسٹری کے کاغذات پر امیت شاہ نے دستخط کیے۔ رجسٹری کی کاروائی مکمل ہوگئی تھی۔

☆☆

○

ایک گھنٹہ کے بعد وہ اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ جیپ کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا سوٹ کیس تھا۔ جس میں ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے تھے۔ سندرا اور رکمنی پچھلے حصے کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے بیگ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

درمیانی سیٹ پر موہن کی گود میں پوشیا لیٹا ہوا تھا۔ موہن اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پوشیا کا سر بھی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔ پوشیا کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے اور اس کی آنکھیں بند تھی۔

رجسٹری کے بعد امیت شاہ نے وہ بڑا سا سوٹ کیس دلیپ کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''دلیپ بھائی....... پورے ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے ہیں۔''

''وہ دس لاکھ جرمانے کے کاٹ لیے ہیں''...... امیت شاہ سوٹ کیس دلیپ کی بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کوئی بات نہیں امیت بھائی''....... دلیپ نے جواب دیا۔

اس کے پاس جواب دینے کے لیے دوسرے الفاظ نہیں تھے۔ اس نے امیت شاہ اور

اس کے وکیل سے ہاتھ ملائے اور بڑا سا سوٹ کیس اٹھا کر اپنی جیپ کی طرف بڑھایا۔ وہ پہلے ہی رجسٹرار سے ہاتھ ملا کر ایک لاکھ روپئے کا لفافہ اس کے حوالے کر چکا تھا۔

پوشیا کو جیپ میں ڈال دیا گیا تھا لیکن رکمنی، موہن اور سندر باہر ہی کھڑے اس آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

دلیپ نے اپنے ہاتھوں کا بڑا سا سوٹ کیس رکمنی کی طرف بڑھا دیا۔

رکمنی نے جھپٹ کر وہ سوٹ کیس لے تو لیا لیکن وہ اس سوٹ کیس کو اٹھا نہیں پائی۔ وہ سوٹ کیس بہت وزنی تھا۔ اس میں اس سوٹ کیس کو اٹھانے کی طاقت نہیں تھی۔

رکمنی ایک کروڑ چالیس لاکھ روپیوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اٹھا نہیں پا رہی ہے یہ دیکھ کر سندر نے وہ سوٹ کیس اس کے ہاتھ میں سے لے لیا اور اسے اٹھا کر جیپ کے پچھلے حصے کی طرف بڑھا۔ سوٹ کیس جیپ کے پچھلے حصے میں چڑھا کر وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

رکمنی بھی آ کر اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ موہن درمیانی سیٹ پر جا بیٹھا۔

''چلیں......؟'' دلیپ نے پوچھا۔

''بالکل'' ......سب نے ایک آواز میں جواب دیا۔ دلیپ نے جیپ اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف چل دیا۔

ہر کسی کے چہرے پر سکون تھا اور ایک ایسی خوشی کے تاثرات جو انھیں اچانک مل گئی تھی اور جس کے ساتھ ان کی کئی دنوں سے آنکھ مچولی جاری تھی۔ انھیں پوشیا کی کوئی پرواہ نہیں تھیں۔

سب اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔

ان کی آنکھوں کے سامنے ایک کروڑ چالیس لاکھ کی نوٹیں، ان نوٹوں میں ان کا حصہ اور اپنے خواب ناچ رہے تھے۔ اپنے خیالوں میں کھوئے موہن کو جیسے ہی کچھ یاد آیا۔ اس نے پوشیا کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا تو چونک پڑا۔ پوشیا کا چہرہ برف کی طرح سرد تھا۔ اس نے پوشیا کے جسم کے

دوسرے حصوں کو چھو کر دیکھا۔اس کے جسم کا یہ حصہ برف کی طرح سرد تھا۔اس نے جیسے ہی پوشیا کے ان ہاتھوں کو چھوا جو اس کے سینے پر رکھے تھے۔

ان میں سے ایک ہاتھ جس کا انگوٹھا رجسٹری کے کاغذات پر لگایا گیا تھا اچانک ایک دم سے پوشیا کے سینے سے سرک کر سیٹ کے نیچے جھولنے لگا۔

''دلیا''.............اچانک وہ زور سے چیخا۔

اس کی چیخ سن کر سب چونک اٹھے۔

''کائے جھالا؟.....(کیا ہوا؟)''سب نے چونک کر پوچھا۔

''بابا گیلا (بابا ختم ہو گیا ہے)''.......موہن نے جواب دیا۔یہ سنتے ہی دلیپ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

''ٹھیک ہے تھوڑی دیر صبر کرو.......ہم دس منٹ میں گھر پہنچنے والے ہیں''.......اور اس نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔

☆☆

ایم مبین کی کتابیں

اردو :

(۱) ٹوٹی چھت کا مکان — افسانوی مجموعہ
(۲) نئی صدی کا عذاب — // (مہاراشٹر اردو اکادمی کا ایوارڈ)
(۳) مال مفت — بچوں کے لیے یک بابی ڈرامے (مہاراشٹر اردو اکادمی کا ادب اطفال ایوارڈ)
(۴) گدھے کی چوری — //
(۵) ہزار روپیہ کا نوٹ — //
(۶) پپو پاس ہوگیا۔ — //
(۷) جھنگا پہلوان نے کرکٹ کھیلا — بچوں کے لیے مزاحیہ کہانیاں
(۸) سرکٹی لاشیں — بچوں کے لیے ناول
(۹) سونے کی مورتی — //
(۱۰) زحل کے قیدی — سائنس فکشن ناول
(۱۱) سوپر کمپیوٹر کی دہشت — سائنس فکشن ناول
(۱۲) میرا نام کرے گا روشن — بچوں کے لیے یک بابی ڈرامے
(۱۳) رانگ نمبر — بچوں کے لیے یک بابی ڈرامے
(۱۴) انمول ہیرا — بچوں کے لیے کہانیاں
(۱۵) جادوئی چراغ — بچوں کے لیے کہانیاں
(۱۶) سوپر کمپیوٹر کی دہشت — سائنس فکشن ناول
(۱۷) لمس — افسانوی مجموعہ (زیر طبع)

ھندی :-

(۱)	یاتنا کا ایک دن	افسانوی مجموعہ (غیر ہندی داں ادیبوں کا قومی ایوارڈ)
(۲)	اذان	״
(۳)	وراثت	״
(۴)	ریوڑ	ناول (مہاراشٹر ہندی اکادمی کا منشی پریم چند ایوارڈ)
(۵)	باچھ	یک بابی مزاحیہ ڈرامے
(۶)	ادبھوت مانو	بچوں کے لئے ناول، سائنس فکشن
(۷)	شنی گرہ کے قیدی	״
(۸)	انترکش میں کھوئے	״
(۹)	سوپر کمپیوٹر کا آتنگ	״
(۱۰)	دھرتی پر سنکٹ	״
(۱۱)	مشن جنگل	ناول
(۱۲)	رہسیہ مے ٹاپو	״
(۱۳)	سات عجوبے	کہانیاں
(۱۴)	ویرو استاد کی ہاسیہ کہانیاں	״
(۱۵)	اسٹار وار	״
(۱۶)	عقل کا سودا	بچوں کے لیے ڈرامے
(۱۷)	مفت کی مٹھائی	״
(۱۸)	اپرادھی کون	بچوں کے لیے یک بابی ڈرامہ
(۱۹)	گدھے کی چوری	״
(۲۰)	سچی دولت	״
(۲۱)	انعام نہیں ملا	״

(۲۲) ہزار روپیہ کا نوٹ 〃

(۲۳) ویرو استاد کا آتم دہن مزاحیہ ناول زیر طبع

رابطہ

ایم مبین

۳۰۳۔کلاسک پلازہ تین بتی۔بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲،ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

موبائل :- 9322338918

ای میل :- mmubin123@gmail.com

ویب سائٹ :- www.adabnama.com

تعارف

قلمی نام : ایم مبین

نام : محمد مبین

والد کا نام : محمد عمر محمد یوسف

جاے پیدائش : ایولہ ضلع ناسک

وطنِ ثانی : بھیونڈی ضلع تھانہ

تاریخِ پیدائش : ۲ جون ۱۹۵۸ء

تعلیم : ایم کام، جی ڈی سی اینڈ اے

ملازمت : ناگرک سہکاری بینک لمیٹڈ بھیونڈی میں برانچ منیجر کے عہدے پر فائز

لکھنے کی ابتدا : ۱۹۷۴ء میں بچوں کے لیے کہانیاں سے، اردو اور ہندی زبانوں میں مسلسل تخلیقی سرگرمیاں

اعزازات :
- ہندی افسانوی مجموعہ 'یاتنا کا یک دن' کو ہندی ڈائریکٹریٹ غیر ہندی دان ادیبوں کا قومی اعزاز پچاس ہزار روپیہ بدست وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی
- بچوں کے ڈراموں کے مجموعہ 'مالِ مفت' کو مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی کا ادب اطفال کا ایوارڈ
- ہندی ناول 'ریوڑ' کو مہاراشٹر راجیہ ہندی ساہتیہ اکادمی کا منشی پریم چند ایوارڈ
- اردو افسانوی مجموعہ 'نئی صدی کا عذاب' کو مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی کا فکشن کا ایوارڈ
- کتاب 'جھنگا پہلوان نے کرکٹ کھیلا' کو مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی کا ادب اطفال کا ایوارڈ

مدیر : 'ادب نامہ' (ویب سائٹ: www.adabnama.com)

رابطہ : ایم مبین ۳۰۳، کلاسک پلازہ، تین بتی، بھیونڈی ۔۴۲۱۳۰۲، ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

موبائل : 9322338918

ای میل : mmubin123@gmail.com

OSHAN PUBLICATIONS
E-mail: oshan.publications1@gmail.com
Mob. 0-9990422798, Ph. 011-32662433

ISBN: 81-86-735-35-6